بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حُزن

(قسط نمبر:2)

گاڑی کو پارکنگ ایریا میں کھڑا کرتا وہ برق رفتاری سے اُسے لاک کرتا اسپتال کی جانب بھاگ رہا تھا۔

اسپتال کا بڑا لان اِس وقت حبس زدہ تھا۔

لان کو عبور کرتا وہ بھاگتا ہوا ہسپتال کی راہداری میں داخل ہوا تھا۔

کمرہ نمبر 704 میں کمال کے کمرے کے باہر شمیم پریشانی سے ٹہل رہی تھیں۔

عادل نے اُنہیں دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ اُس کے قدموں نے مزید جلدی پکڑ لی۔

ایک ہی جست میں اُس نے برآمدہ پار کیا۔ بنا خالہ سے ملے وہ فٹ سے دروازہ کھولتا اندر داخل ہوا۔

پسینے میں شرابور وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

اندر کا منظر دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹھکا تھا۔

کمرے میں بیٹھے تینوں نفوس اُس کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

چند لمحے کے لیے وہ وہیں ٹھہر سا گیا تھا۔

"ارے عادل تم۔۔۔؟" اُسے یوں دروازے میں کھڑا دیکھ ایک آدمی اپنی جگہ سے اُٹھا تھا، سفید سوٹ میں ملبوس سر پر پگڑی رکھے وہ بہت باوقار سا لگ رہا تھا۔

من کی کالک سفید کپڑوں سے چھپا نہیں کرتی۔ عادل نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

عادل نے اپنی پیشانی پر آئے پسینے کو ہاتھ سے صاف کیا۔

"آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" بنا سلام دعا کیے اُس نے شہیر راجپوت کی آنکھوں میں دیکھے سپاٹ سے انداز میں کہا۔

پاس بیٹھا جلال خاموشی سے کھڑا ہوا۔ تیکھے و سحر بھرے نقوش، چھوٹی سی آنکھیں، وہ بھی سفید شلوار سوٹ میں ملبوس شال کندھے پر جمائے عادل سے مخاطب ہوا۔

اُس کی شخصیت میں رعب تھا۔ عادل نے اُس کی طرف دیکھا۔

"اسلامُ علیکم!" اُس کی وزنی آواز سن کر عادل کو بہت غصہ آیا تھا۔

"میں نے پوچھا کہ آپ لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔۔" جلال کی آنکھوں میں غصے سے گھورتے ہوئے اس نے اپنا رخ شہیر کی جانب کیا۔

" ملنے آئے تھے آپ لوگوں سے۔ آخر کو ہمارے ہی گاؤں کے لوگ ہیں آپ۔" چھت پر لٹکا پنکھا آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔

شہیر کی بات سُن کر عادل نے غصے سے اپنی دونوں مٹھیاں مضبوطی سے بند کیں۔

" دیکھو عادل بیٹا ہم تو یہاں تم لوگوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔" شہیر کی بات پر اُس نے فوراً سے اپنا ہاتھ کھڑا کر کہ اُن کو چپ رہنے کا کہا۔

"ہمیں آپ کی کسی بھی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنے برے دن نہیں آئے کہ آپ جیسوں سے مدد لینی پڑے ہمیں۔۔" عادل کا غصہ اتنا واضح تھا کہ کمال بھی اب اپنے اعصاب کو استعمال کرنے لگ گیا تھا۔

" بیٹے اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ ہم تو آپ سب کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔" شہیر نے بڑے شفقت بھرے لہجے میں کہا تھا، اُن کی بات سُن کر عادل کے دماغ کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔

"میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں اس لیے یہ ڈھونگ رچانا بند کریں آپ، خدا کا واسطہ ہے۔"عادل نے بیزاری سے کہا تھا۔

"ایسے کیسے نہیں ہو تم ہمارے بیٹے؟ اپنے ہاتھوں میں بڑھا کیا ہے تمہیں ہم نے۔۔"شہیر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اُس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"جن ہاتھوں نے ہمیں پال کر بڑھا کیا وہ اب اس دُنیا میں نہیں رہے۔"ضبط کرتے ہوئے عادل نے شہیر کو کچھ باور کروایا تھا۔

"ہاں، اُن کی جگہ اب ہم جو ہیں۔ اس سب کے لیے۔"اپنی پگڑی کو چھوتے ہوئے شہیر راجپوت نے فخر سے کہا۔۔

"کسی کا اقتدار چھین لینے سے اُس جیسا وقار نہیں مل جایا کرتا شہیر راجپوت۔۔۔"عادل نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا تھا۔

شہیر کے چہرے پر مسکراہٹ فوراً پھیکی ہوئی تھی۔

"اوقات میں رہ عادل۔۔"پاس کھڑا جلال اس وقت اپنے باپ کی بے عزتی پر فوراً سے بولا تھا۔

"آپ لوگ یہاں سے دفع ہونگے یاں میں دھکے مار کر نکالوں یہاں سے؟"جلال کے مقابل پر وہ بھی دھاڑا تھا۔

"تمیز سے بات کرو۔۔"پاس کھڑا جلال غصے سے آگے کو بڑھنے لگا تھا جب درمیان میں شہیر آن کھڑے ہوئے۔

عادل نے آنکھوں میں خون لیے جلال کو دیکھا تھا۔

"اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ مل بیٹھ کر حل نکال لیتے ہیں عادل بیٹے۔"شہیر نے اُس کے

بگڑتے تیور دیکھے تو مزید نرم لہجے میں کہنے لگے۔

"نہ تو ہمیں کسی چیز کا حل چاہیے اور نہ ہی آپ سے بات کرنی ہے۔ ہمارا بات کرنا کسی بھی حوالے سے ٹھیک نہیں ہے، ناہی مجھے آپ سے کوئی غرض ہے اور ناہی آپ کو ہونی چاہیے۔" عادل اب آہستہ آہستہ نارمل لہجے میں بول رہا تھا، کمال ٹھیک تھا اُس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

"ہم گاؤں کے سردار ہیں اور سب ہماری بات مانتے ہیں۔" شہیر نے بڑے فخر سے گردن کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"شہیر راجپوت، آپ اپنے گاؤں میں ہیں سردار۔ یہاں آپ بنا ہماری اجازت کے ہماری زندگیوں میں مداخلت نہیں

کرسکتے، یہ آپ کی پنچایئت نہیں کہ جو آپ کا حکم ہو گا ویسا ہی ہو گا۔" وہ اب ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

شہیر راجپوت نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اس کے لہجے کی سختی اور اندازِ گفتگو اسے ناگوار گزر رہا تھا، مگر وہ ابھی تک اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے تحمل سے بات کر رہا تھا۔

جلال نے حقارت بھرے لہجے میں کہا،

"تم جیسے لوگوں کو ہم اپنی مٹھی میں مسل کر رکھتے ہیں۔ تم ہمیں انکار نہیں کرسکتے۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک نظر کمال پر ڈالی۔

عادل نے فوراً اس کی نگاہوں کا رخ محسوس کیا۔ جلال جس انداز سے کمال کو گھور رہا تھا، وہ عادل کے ضبط کا آخری امتحان بن گیا۔ اس کے اندر دبا ہوا غصہ یکدم بھڑک اٹھا۔

وہ پوری قوت سے دھاڑا،

"یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ! ورنہ میں تم دونوں کو دھکے دے کر باہر نکال دوں گا۔ اور اگر ایک لمحہ بھی مزید یہاں رکے تو میں ابھی پولیس کو کال کر دوں گا!"

"تم ایسا نہیں کر سکتے، عادل۔" جلال کی آواز میں غرور اور دھمکی تھی۔

"کیونکہ تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی کہ تمہاری جان ہماری مٹھی میں ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟ اگر ہم نے اسی وقت یہاں کھڑے ہو کر سارا سچ بیان کر دیا، تو کیا تم اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا سامنا کر سکو گے؟"

شہیر، جو تب سے صبر کیے ہوا تھا، اس کے چہرے پر پھیلی بے نیازی عادل کے غصے کو مزید ہوا دے رہی تھی اور باقی کی کمی جلال کی بات نے پوری کر دی۔

عادل نے اس پر ایک ناگوار نظر ڈالی۔ وہ اپنے ضبط کی آخری حد پر کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مجبور ہے... ہر لحاظ سے مجبور۔

اگر وہ ان کا ساتھ نہ دیتا، تو اپنا دوست کھو دیتا، اور اگر ساتھ دیتا، تب بھی یا تو اپنے دوست سے ہاتھ دھو بیٹھتا یا کسی بے گناہ کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنتا۔

آخر وہ کیا کرتا؟

اس وقت وہ شدید پریشانی کے عالم میں وہاں کھڑا تھا۔

دوسری طرف جلال اس کی بے بسی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی، جبکہ کمال، جو اس تمام معاملے سے مکمل طور پر بے خبر تھا، حیرانی سے کبھی شہیر، کبھی جلال اور کبھی عادل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کے لہجوں،

اشاروں اور باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

عادل نے ایک لمحے کے لیے شہیر کی طرف دیکھا۔ اُس نے کچھ سوچا تھا، چند لمحوں میں ہی وہ سوچ چکا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں تمہاری ان باتوں سے ڈر جاؤں گا؟"

اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اب وہ جلال کو دیکھتا محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے جلال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہا،

تمہیں کیا لگتا ہے، جس بات کا تم ذکر کر رہے ہو، ہم نے اس سے چھپا رکھا ہو گا؟ اسے سب کچھ معلوم " ہے۔"

پھر اس نے بے نیازی سے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"جو کھانا ہے، سکون سے کھالو، کیونکہ یہاں سے تمہیں کسی بھی قسم کی کوئی مدد نہیں ملنے والی۔ اب بہتر یہی ہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"تم جیسے لوگوں کے پاس چاہے جتنا بھی پیسہ، اقتدار، حکومت یا رُتبہ آجائے، تم لوگ اندر سے اتنے ہی مفلس رہتے ہو۔ تمہیں نہ خدا کا خوف ہے، نہ اس بات کا احساس کہ تم کسی کی زندگی تباہ کر رہے ہو۔"

اب وہ دروازے کے پاس سے چلتا کمال کے پاس آیا تھا۔ شہیر اور جلال اُسے غصے سے دیکھ رہے تھے۔

"تمہیں یہاں سے کسی بھی قسم کی کوئی مدد نہیں ملنے والی۔ سات آٹھ گھنٹے کا سفر کر کے یہاں آئے ہو، تو آرام سے کھانا کھا کر جانا۔ اگر کھانے کے علاوہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا، میں منگوا دوں گا۔ آخر میں تم لوگوں جیسا تنگ دل

تھوڑی ہوں۔"

اپنی بات مکمل کر کے عادل بے نیازی سے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس کے چہرے پر نہ خوف تھا، نہ پریشانی، بلکہ ایک عجیب سا سکون اور بے اعتنائی تھی۔

شہیر اور جلال نے غصے سے اسے گھورا۔

"تم یہ سب نہیں کر سکتے،" جلال دانت پیستے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو اس کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں، پھر بھی ہمارے مقابلے میں کھڑے ہو؟ ہمارے... راجپوتوں کے سامنے؟"

جلال کے لہجے میں غصہ کھل کر جھلک رہا تھا۔ عادل کی بے پروائی اسے اندر ہی اندر جلا رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ سامنے بیٹھا شخص ان کی دھمکیوں کو اس قدر معمولی سمجھ رہا ہے۔

مگر عادل پر جیسے ان باتوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر انگور کا ایک خوشہ اٹھاتا، ایک ایک دانہ کھاتا رہا، گویا کمرے میں ہونے والی تلخ گفتگو اس کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔

وہ سمجھ چکا تھا... راجپوتوں کا کھیل، ان کی چالیں، ان کی مجبوری... سب کچھ اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اسی لیے اب وہ بھی انہی کے انداز میں ان کے ساتھ کھیل رہا تھا، اور یہی بات راجپوتوں کو اندر ہی اندر جلا رہی تھی۔

آخر کوئی پیسوں کے لیے اتنا کیسے گر سکتا ہے؟ کوئی اپنی انا اور طاقت کی خاطر انسانیت کو اپنے قدموں تلے کیسے روند سکتا ہے؟

دوسروں کو بے بس کرنے والے آج خود اس کے سامنے بے بس کھڑے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اس وقت یہاں کھڑے ہو کر ایک لفظ بھی سچ بول دیا تو ان کے پاس بچا ہوا آخری راستہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ اور وہ ایسا ہر گز نہیں ہونے دے سکتے تھے۔

عادل ان کی ہر چال سمجھ چکا تھا۔ اسی لیے اب وہ پہلے والا عادل نہیں رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بے نیازی تھی، جیسے اسے کسی چیز کی پرواہی نہ ہو۔

اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ اس کے سامنے باغر اکا سردار، شہیر راجپوت، کھڑا ہے...

یا اس کے ساتھ اس کا وہ بیٹا، جس کے غصے اور لالچ سے ہر کوئی واقف تھا۔

عادل کی نظریں دونوں کے چہروں پر جمی تھیں۔ نہ اس کے لہجے میں خوف تھا، نہ نگاہوں میں جھجک۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت طاقت ان کے ہاتھوں میں نہیں...

جلال آگے بڑھا ہی تھا کہ عادل پر ہاتھ اٹھائے، مگر عین اسی لمحے شہیر راجپوت نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جلال کو اشارہ کیا کہ ابھی نہیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہیر نے اپنے لہجے کو غیر معمولی حد تک پر سکون رکھتے ہوئے عادل کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں اس وقت جا رہا ہوں... مگر یہ مت سمجھنا کہ بات یہاں ختم ہو گئی ہے۔ میں واپس آؤں گا، اور اگلی بار پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا۔ تب تمہارے پاس ہمیں انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں بچے گی۔"

وہ ایک قدم اس کے قریب آیا، اس کی نظریں سرد اور بے رحم تھیں۔

اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا... جو بھی ہم سے ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے، اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔"

اس نے ایک لمحے کو توقف کیا، پھر زہر گھولتی آواز میں بولا،

"اپنی ماں کو تو تم پہلے ہی کھو چکے ہو۔ اب کیا اپنے دوست کو بھی کھونا چاہتے ہو؟"

عادل کا چہرہ سپاٹ رہا، مگر اس کی بندھی ہوئی مٹھیاں اس کے اندر اٹھتے طوفان کا پتا دے رہی تھیں۔

شہیر نے اس کے قریب جھک کر دھیمے مگر کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"اور اگر وہ دوست بھی تم سے چھن گیا... تو تمہارے پاس بچے گا ہی کیا؟ اپنے دوست کی بیمار ماں، جس کا بوجھ چند دن بعد شاید تم خود بھی نہ اٹھا سکو۔۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک سرد مسکراہٹ ابھری۔

"اور اس کی بہن..." اس نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر پھر کہا، "اگر ہم چاہیں تو اسے بھی تمہاری نظروں سے ہمیشہ کے لیے غائب کر سکتے ہیں۔"

عادل نے اپنا لہجہ بدستور سپاٹ رکھا۔ اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ خاموشی سے شہیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا رہا، جیسے اس کی ہر دھمکی کو خاموشی سے چیلنج کر رہا ہو۔

جلال ایک طرف کھڑا یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی طنزیہ مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ اسے یہ سب کسی تماشے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

ادھر بیڈ پر پڑا اکمال نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مشینوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں کبھی عادل پر ٹھہرتیں تو کبھی شہیر اور جلال پر۔ وہ نہ پوری طرح ہوش میں تھا، نہ اتنا بے ہوش کہ ارد گرد ہونے والی باتوں سے بالکل بے خبر رہتا۔ مگر اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سمجھ پاتا یہاں آخر ہو کیا رہا ہے۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا، بس بے بسی سے سب کچھ دیکھنے پر مجبور تھا۔

شہیر راجپوت نے عادل پر ایک آخری نظر ڈالی، پھر سیدھا ہو کر مڑا۔ اگلے ہی لمحے وہ جلال کو اپنے ساتھ لیے اسپتال کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر کمال کی ماں، شمیم، کب سے بے چینی کے عالم میں کھڑی تھیں۔ جیسے ہی شہیر راجپوت اور جلال کمرے سے باہر نکلے، وہ گھبرا کر ایک طرف ہو گئیں۔

گزرتے ہوئے شہیر راجپوت نے ان پر ایک سرد اور کرخت نظر ڈالی، مگر بغیر کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد دونوں ہسپتال کی راہداری میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی شمیم جلدی سے کمرے کے اندر داخل ہوئیں، جہاں عادل خاموشی سے کمال کے بیڈ کے قریب بیٹھا تھا۔

کمال بدستور نیم بے ہوشی کی حالت میں مشینوں میں جکڑا لیٹا تھا، جبکہ عادل گہری سوچ میں ڈوبا اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔

شمیم نے اندر آتے ہی پریشانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا، عادل؟ وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے؟"

عادل نے ایک لمحے کے لیے ان کی طرف دیکھا، پھر اپنے لہجے کو معمول پر رکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں، خالہ۔۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

"مگر وہ چاہتے کیا ہیں؟ سب کچھ تو ہم نے کیا جو اُنہوں نے کہا۔ اب کیوں ہمیں پریشان کرنے آ گئے ہیں؟" شمیم نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"خالہ وہ جائیداد اپنے نام کروانا چاہتے ہیں۔ باغ راکی جتنی بھی جائیداد ہے۔" عادل نے کہا تو شمیم نے اُس کی جانب پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔

"تو ہم کیا مدد کریں اس سب میں اُن کی؟" شمیم نے پھر سوال کیا۔

"کمال کی مدد چاہتے ہیں وہ۔ وہ اُسے جذباتی طور پر توڑنا چاہتے ہیں۔ تاکہ جیسا وہ چاہیں وہی ہو۔"

"ایسا مت ہونے دینا عادل بیٹا۔ بہت تکلیں دیکھی ہیں اُس نے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں خالہ۔ میں سنبھال لونگا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر کمال کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"آپ بس ابھی اس کا خیال رکھیں۔ کل تک میں یہاں کے سارے کاغذات بھی مکمل کروا دیتا ہوں، پھر ہم اسے کسی دوسرے ہسپتال میں منتقل کر دیں گے۔"

اتنا کہہ کر اس نے نرمی سے کمال کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بے بسی اور ترس تھا جیسے وہ خود کو کمال اس

حالت کا قصوروار سمجھ رہا ہو۔

شمیم خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے بس آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆☆☆☆

شام کے تقریباً چار بج رہے تھے جب شاہد دن بھر کا کام نمٹا کر گھر واپس لوٹا۔ گھر میں غیر معمولی سی خاموشی تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو زہرہ خاموشی سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس کی طبیعت صبح سے ہی کافی خراب تھی، مگر اس نے نجمہ یا نگینہ کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ جانتی تھی، اگر ان

دونوں میں سے کسی کو بھی اپنی طبیعت کے بارے میں بتائے گی تو تیمارداری کے بجائے باتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ خاموشی سے تکلیف برداشت کیے لیٹی رہی۔

شاہد نے جیسے ہی اس پر نظر ڈالی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس آیا، نرمی سے اس کا کندھا ہلایا اور سہارا دے کر اسے بٹھاتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

"کیا ہوا، زہرہ؟ تم ٹھیک تو ہو؟"

زہرہ نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"ہاں شاہد۔۔۔ بس ذرا طبیعت خراب تھی، اسی لیے لیٹ گئی تھی۔"

مگر اس کا اترا ہوا چہرہ، بجھی ہوئی آنکھیں اور بے جان آواز صاف بتا رہی تھی کہ وہ صرف "ذرا" بیمار نہیں تھی، بلکہ کافی دیر سے تکلیف برداشت کر رہی تھی۔

شاہد نے اس سے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ خاموشی سے اٹھا، کچن میں گیا، اس کے لیے کھانا گرم کیا، پلیٹ میں نکالا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے زہرہ کو چند نوالے کھلائے، پھر اسے دوا دی۔ جب وہ کچھ بہتر محسوس کرنے لگی

تو وہ بھی وہیں اس کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا، مگر اس کی نظریں بار بار زہرہ کے چہرے پر ہی جا ٹھہرتیں۔

ادھر صحن میں نجمہ اور نگینہ کسی کام میں مصروف تھیں۔ شاہد کو گھر آئے کافی دیر ہو چکی تھی، مگر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

نجمہ نے ناگواری سے منہ بنایا اور نگینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

دیکھا تم نے؟ کیسا زن مرید بنتا جارہا ہے۔ نہ آ کر ماں کو سلام کیا، نہ بہن سے دو باتیں کیں، سیدھا بیگم "

"کے پاس جا پہنچا۔

نگینہ نے بھی ہونٹ سکیڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"اللہ بچائے ایسی بہوؤں سے۔۔ ہمارے بیٹے کو تو پوری طرح اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ پہلے گھر والے نظر

آتے تھے، اب

ہر وقت بس بیوی ہی دکھائی دیتی ہے۔"

نجمہ کے لہجے میں شکوہ کم اور جلن زیادہ تھی، جبکہ کمرے کے اندر بیٹھا شاہد ان سب باتوں سے بے خبر، صرف اپنی بیمار بیوی کی فکر میں گم تھا۔

"ایسا کرو زہرہ کچھ دن اپنے میکے چلی جاؤ، خالہ تمہاری صحیح سے دیکھ بھال کر لیں گیں، میں تو سارا دن کام میں اُلجھا ہوا رہتا ہوں تین چار دن میں تمہیں واپس لے آؤں گا۔" کھانا کھاتے ہوئے شاہد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جی وہ میں نے صبح ماں جی سے پوچھا تھا اُنہوں نے کہا کہ نگینہ کے دن پکے ہو جائیں پھر چلی جانا۔" اتنی سی

بات کرتے

ہوئے وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"اچھا آپ اُن کی فکر نہیں کریں میں دیکھ لونگا، بس آپ اپنا خیال رکھیں۔" اتنا کہہ کر وہ اُسے دیکھ رہا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی جھولی میں رکھے ہاتھوں کو۔ وقت یوں ہی سرکتا جا رہا تھا جب وہ کھانا کھا کر برتن اُٹھائے کمرے سے سیدھا باورچی خانے میں گیا تھا۔

"شاہد برتن رکھنے کے بعد کچھ دیر ماں کو بھی دے لینا۔" کان کے پیچھے دوپٹہ سرکاتی نجمہ نے شاہد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھیں اُس وقت سبزی بنا رہی تھیں۔

"جی ماں ابھی آتا ہوں۔۔" مسکراتے ہوئے اُس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور برتن رکھ کر سیدھا اُن کے پاس چلا آیا۔

کافی دیر وہ اُن کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔

☆☆☆

تقریباً شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے جب شمیم ڈرائیور کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر گھر کے اندر داخل ہوئیں۔

ادھر مہک تب سے صحن میں ہی چکر لگا رہی تھی۔ جب سے عادل گیا تھا اس کے حلق سے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں اُترا تھا۔ نہ اس نے کچھ کھایا تھا، نہ کسی کام کو ہاتھ لگایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور لبوں پر مسلسل دعائیں جاری تھیں۔ وہ بار بار اللہ تعالیٰ سے اپنے بھائی کی سلامتی مانگ رہی تھی۔

جیسے ہی اس کی نظر گیٹ سے اندر آتی ہوئی شمیم پر پڑی، وہ تقریباً دوڑتی ہوئی ان کے پاس آ گئی۔

"ماں... کیا ہوا؟ کمال کیسا ہے؟"

اس نے بے چینی سے ان کے دونوں بازو تھام لیے۔

"مجھے۔۔۔ عادل نے بتایا تھا کہ جلال ہسپتال آیا تھا۔ ماں، پلیز بتائیں نا۔۔ کمال ٹھیک ہے نا؟ اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اسے ہوش آیا؟ سب ٹھیک تو ہے؟"

وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بول گئی۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ آخری الفاظ کے ساتھ ہی اس کی آواز رُندھ گئی۔

ان کے والد اس وقت دبئی میں تھے، اور یہاں گھر کے سارے حالات شمیم اکیلی سنبھال رہی تھیں۔ ان کے دل پر کیا گزر رہی تھی، یہ شاید کوئی نہیں جان سکتا تھا۔
شمیم نے آگے بڑھ کر مہک کے گال تھپتھپائے۔
"بیٹا۔۔۔ گھبراؤ مت۔ اللہ کے فضل سے کمال پہلے سے بہتر ہے۔ عادل آج رات وہیں ہسپتال میں رہے گا، اور کل تک اسے کسی دوسرے ہسپتال میں شفٹ کر دے گا۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
وہ جانتی تھیں کہ ان کی یہ تسلی مہک کے دل کا خوف ختم نہیں کر سکتی، مگر اس وقت اس کے سوا ان کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔
وہ اسے اپنے ساتھ لیے اندر کمرے میں آ گئیں۔
کمرے کی روشنی میں مہک کی حالت اور بھی خراب لگ رہی تھی۔ صبح سے وہ اُنہیں کپڑوں میں تھی۔ چادر جانے کب کی ایک طرف رکھ دی تھی، دوپٹہ بھی گلے میں نہیں تھا۔ بالوں کی چند لٹیں بے ترتیبی سے چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔ آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سرخ اور سوجھی ہوئی تھیں، جبکہ چہرے کی زردی صاف بتا رہی تھی کہ اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔
شمیم نے خاموشی سے اسے بستر پر بٹھایا۔ پہلے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں دیا، پھر بڑی مشکل سے اسے چند نوالے کھلائے۔ اس کے بعد دوائی دی۔
مہک نے بغیر کچھ کہے سب کچھ کر لیا۔
وہ اب مزید ہمت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے بستر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، جبکہ اس کی انگلیاں اب بھی تسبیح کے دانوں پر چل رہی تھیں۔

شمیم نے عمر بھر جدوجہد کی تھی تاکہ ان کے دونوں بچے زندگی میں ایک اچھے مقام تک پہنچ سکیں۔ اپنی ہر خواہش، ہر آرام اور ہر خوشی کو پسِ پشت ڈال کر انہوں نے صرف اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کی تھی۔

مگر آج قسمت نے انہیں ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ان کا ایک بیٹا کسی کے غم میں ہسپتال کے بستر پر بے بس پڑا تھا، جبکہ دوسری طرف ان کی بیٹی اسی بھائی کے دکھ میں اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔

حالانکہ مہک کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ہر آسائش، ہر سہولت اس کے پاس موجود تھی، مگر کچھ رشتوں کی اہمیت دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ محب صرف اس کا بھائی نہیں تھا، اس کی طاقت، اس کی خوشی اور اس کے سکون کا دوسرا نام تھا۔ دونوں بہن بھائی لڑتے بھی تھے، ایک دوسرے سے ناراض بھی ہوتے تھے، لیکن ان کے درمیان موجود محبت ہر شکوے، ہر ناراضی پر ہمیشہ غالب آ جاتی تھی۔

شمیم کے لیے اپنے دونوں بچوں کو اس حال میں دیکھنا آسان نہیں تھا۔ ایک ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے، یہ شاید لفظ کبھی بیان ہی نہیں کر سکتے۔ مگر وہ ٹوٹنے کی اجازت خود کو نہیں دے سکتی تھیں۔

وہ ماں تھیں۔۔۔ اور ماں کو اکثر اپنے آنسوؤں سے پہلے اپنے بچوں کا سہارا بننا پڑتا ہے۔

انہوں نے دل اپنا مضبوط کیا۔ وہ اپنے بچوں کو اس حال میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں، نہ ہی چھوڑنا چاہتی تھیں۔ انہیں یقین

تھا کہ ایک دن وہ دونوں پھر سے سنبھل جائیں گے، اپنے قدموں پر پہلے سے زیادہ مضبوطی سے کھڑے ہوں گے، اور وہ انہیں اسی روپ میں دوبارہ دیکھنا چاہتی تھیں۔

خاموشی سے انہوں نے مہک کی طرف دیکھا۔ پھر خود بھی چند نوالے کھائے، اسے بھی اپنے ہاتھوں سے کھلایا، اور اس کے بعد خاموشی سے عادل کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔

تقریباًرات کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب عادل گھر میں داخل ہوا۔ پورا صحن گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف برآمدے کی ایک زرد سی لائٹ جل رہی تھی، جبکہ کچن اور اس کمرے سے ہلکی روشنی باہر بکھر رہی تھی جہاں شمیم اور مہک موجود تھیں۔

وہ خاموش قدموں سے صحن عبور کرتا، برآمدے سے گزرااور آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا۔

سامنے کا منظر اس کے قدم وہیں روک دینے کے لیے کافی تھا۔

شمیم کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ایک ہاتھ کرسی کے ہتھے پر ٹکا ہوا تھا، جبکہ دوسرا ہاتھ اپنے ماتھے کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ آنکھیں بند تھیں، جیسے تھکن نے انہیں چند لمحوں کے لیے بے خبر کر دیا ہو، مگر چہرے پر پھیلی پریشانی صاف بتا رہی تھی کہ نیند ان کی آنکھوں سے ابھی بہت دور تھی۔

دوسری طرف مہک بیڈ پر لیٹی گہری نیند میں سو رہی تھی۔ روتے روتے شاید اس کی آنکھ لگ گئی تھی، اسی لیے اس کے چہرے پر بھی تھکن اور اداسی کے نقوش ابھی تک نمایاں تھے۔

عادل نے بنا کسی آواز کے چند قدم آگے بڑھائے۔ پھر دھیمے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

"خالا۔۔"

شمیم نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور فوراًاس کی طرف دیکھا۔

"آپ کمرے میں جا کر آرام سے سو جائیں، میں آگیا ہوں۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجیے، میں لے آتا

ہوں۔"

شمیم نے نفی میں ہلکے سے سر ہلایا۔ پھر خاموشی سے کرسی سے اُٹھیں، مہک کے قریب آئیں اور جھک کر اس کے ماتھے پر ایک شفقت بھرا بوسہ ثبت کیا۔ نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، جیسے اس کی ساری تکلیف اپنی ہتھیلی میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔

پھر عادل کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ رکھا۔ اس ایک لمس میں نہ جانے کتنی دعائیں، کتنی بے بسی اور کتنا

اعتماد چھپا ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

دروازہ بند ہوتے ہی عادل کی نظریں بے اختیار مہک کی طرف اُٹھ گئیں۔

وہ معصوم بچے کی طرح گہری نیند میں سو رہی تھی۔ چہرہ بے حد مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجھ چکی تھیں، پلکوں پر اب بھی نمی کے ہلکے سے آثار موجود تھے۔ رنگ پہلے سے زیادہ زرد دکھائی دے رہا تھا اور وجود کمزوری سے جیسے سمٹ کر رہ گیا تھا۔

عادل نے ایک گہرا سانس لیا، آہستگی سے جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور احتیاط سے کمرے کی لائٹ بند کر دی۔

اس کے بعد وہ واش روم میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہلکی سی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہنے واپس آیا۔ خاموشی سے مہک کے ساتھ والے بیڈ پر ایک طرف لیٹ گیا تاکہ اس کی نیند میں کوئی خلل نہ آئے۔

کمرے میں مکمل سکوت چھا گیا۔

رفتہ رفتہ رات اپنی گہرائی میں اُترنے لگی۔ پورا گھر خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ ہر طرف ایسا سناٹا تھا جیسے دیواریں بھی اپنے اندر نہ جانے کتنے دکھ سمیٹے خاموش کھڑی ہوں۔

☆☆☆☆

صبح کے چھ بج رہے تھے جب اُس کی آنکھ کھلی۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے نیچے اُتری تاکہ کوئی آواز نہ ہو۔ ایک نظر اس نے اپنے برابر میں سوئے شاہد پر ڈالی، جو اب تک گہری نیند میں تھا۔ وہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی، بیڈ سے پاؤں نیچے لٹکاتے ہوئے جوتا پہنا اور پھر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اتوار کا دن تھا، اس لیے آج سب ذرا دیر سے اُٹھنے والے تھے۔ نجمہ اور نگینہ اب بھی اپنے کمروں میں سو رہی تھیں۔ جبکہ سکینہ حسبِ معمول کچن میں بیٹھیں مکھن نکال رہی تھیں۔

زہرہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی، سکینہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور ہاتھ کے اِشارے سے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔

"زہرہ۔۔۔ میری بات سنو۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کل شام شاہد میرے پاس آیا تھا۔ وہ کہنے لگا، "تم میکے جانا چاہتی ہو؟ میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ نگینہ کی بات پکی کرنے، تاریخ طے کرنے وہ لوگ آنے والے ہیں۔ بس ایک بار وہ لوگ آجاتے، اس کے بعد تم آرام سے چلی جانا۔"

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا، پھر قدرے شکوہ بھرے لہجے میں بولیں۔

"لیکن تم سے تو ایک دن بھی صبر نہ ہوا۔ سیدھا جا کر اپنے شوہر سے شکایت لگا دی، اور اُسے بھی میرے پاس اپنی حمایت کرنے کے لیے بھیج دیا۔"

چند لمحے خاموش رہ کر انہوں نے دوبارہ کہا۔

"خیر۔۔۔ جانا ہے تو چلی جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اس طرح کی حرکتیں کرنا مجھے بالکل مناسب نہیں لگتا۔"

زہرہ خاموش کھڑی اُن کی ایک ایک بات سنتی رہی۔ ہر لفظ اُس کے دل پر بوجھ بنتا جارہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اپنی صفائی دے، بتادے کہ اُس نے کسی سے کوئی شکایت نہیں کی، مگر اُس نے لب نہ کھولے۔ وہ بس خاموشی سے سب کچھ سہتی رہی۔

"ہم تو تمہاری اتنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی تمہیں برداشت کر رہے ہیں، اور تم ہماری اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتیں؟"

ان کے لہجے میں شکوے سے زیادہ طنز تھا۔ ہر لفظ جیسے زہرہ کے دل پر چوٹ لگا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ نہ صفائی دی، نہ کوئی جواب دیا۔ بس اُن کی ایک ایک بات اپنے اندر اُتارتی رہی۔

"ہم نے تو شاہد کی شادی تم سے یہ سمجھ کر کروائی تھی کہ تم ایک اچھے گھرانے کی، سادہ سی لڑکی ہو۔ مگر تم تو بڑی چالاک نکلی۔ ہمیں تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ آج کل ایسی تیز لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔"

انہوں نے تلخی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور ایک ہماری نگینہ ہے۔۔۔ جو کہہ دو، بغیر چون وچرا کے مان لیتی ہے۔ کبھی آگے سے سوال تک نہیں کرتی۔"

وہ رُکی نہیں، مسلسل بولتی چلی گئیں۔

"لیکن تم۔۔۔ تم نے تو گھر میں قدم رکھتے ہی شاہد کو اپنے قابو میں کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ بھی تمہاری ہر بات ماننے لگا ہے۔"

زہرہ نے خاموشی سے اپنی نظریں جھکالیں۔ ہر الزام اُس کے دل میں کسی کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا، مگر اس نے حسبِ معمول کوئی صفائی پیش نہ کی۔ وہ خاموشی سے سب سنتی رہی۔

نجمہ کو شاید ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اُن کے لفظ زہرہ کے دل پر کیسے وار کر رہے تھے۔ وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں،

ایک کے بعد ایک بات، جیسے دل میں جمع سارا غصہ آج ہی نکال دینا چاہتی ہوں۔

زہرہ خاموشی سے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ نہ اُس نے سر اُٹھا کر اُنہیں دیکھا، نہ اپنی صفائی میں ایک لفظ کہا۔

وہ تو صرف تھوڑی دیر کے لیے تازہ ہوا لینے باہر آئی تھی، مگر اسے کیا معلوم تھا کہ صبح ہی صبح اسے اتنی ذلت اور طعنے سننے پڑیں گے۔

آخر کار جب نجمہ اپنے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر چکیں یاں یوں کہا جائے بھڑاس نکال چکیں تو انہوں نے سرد لہجے میں اُسے وہاں سے جانے کا کہہ دیا۔

زہرہ نے بھی بغیر کسی سوال، بغیر کسی جواب کے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ چہرہ غم سے بجھ گیا تھا، مگر آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے۔ وہ سیدھی واش روم میں گئی، ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا، خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کی، پھر واپس کمرے میں آکر خاموشی سے بستر پر لیٹ گئی۔

لیٹے لیٹے اس کے ذہن میں ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا۔۔۔ اپنا گھر، آخر اپنا ہی ہوتا ہے۔ شاید سسرال کا یہ گھر ابھی تک اسے اپنا نہ لگا تھا، یا شاید قسمت نے اس کے لیے یہی لکھ رکھا تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی اس موڑ پر آکر یوں بدل جائے گی۔

کتنے حسین خواب تھے اُس کے۔

کچھ تھا جو اُس کے ذہن میں دھندلانے لگا تھا۔

وہ اپنے ذہن پر زور دیتی اب کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی لیکن سر درد کی اُس شدت کو برداشت کرپانا اُس کے لیے مشکل ہوتا جارہا تھا۔

یکدم اُس نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔

اُس کے یوں اچانک اُٹھ کر بیٹھنے سے پاس سویا شاہد بھی چونک کر اُٹھ بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہو تم زہرہ۔۔۔؟" اُس نے اُٹھتے ہی پریشانی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں سر میں بہت شدید درد ہو رہی ہے۔" اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے تھامے اُس نے درد کی شدت کی وجہ سے کراہتے ہوئے کہا۔

"زیادہ طعبیت خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلیں؟" وہ اب مکمل ہوش میں آچکا تھا۔

زہرہ نے نفی میں سر ہلایا۔۔

"اچھا رکو میں دوائی دیتا ہوں۔۔" اس نے فوراً سے اُٹھتے دراز میں سے دوائی اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔

"کونسی کھانی ہے؟" اُس نے زہرہ سے پوچھا تھا۔

"یہ ہرے پتے والی۔۔" ایک نظر دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

شاہد نے فوراً سے اُسے گلاس میں پانی ڈال کر وہ گولی ہاتھ میں تھمائی۔ منہ میں گولی ڈالتے ہی اُس نے پانی کے دو بڑے بڑے گھونٹ پیئے۔

"لیٹ جاؤ طعبیت خراب نا ہو جائے ایسے۔۔" تکیہ درست کرتا وہ لیٹنے میں مدد کرتا اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کا بخار چیک کر رہا تھا۔

"بخار تو نہیں ہے پھر کیا ہوا۔۔؟ پیٹ میں درد ہے؟" وہ اُس سے پوچھ رہا تھا اور اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا ابھی آرام کرو ہو جاتی ہے طعبیت ٹھیک۔۔" اب وہ پریشانی سے ٹہل رہا تھا۔

زہرہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھ لگ چکی تھی، لیکن شاہد اُس کی طبیعت کو لے کر کافی زیادہ پریشان تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ زہرہ کو اس کے میکے چھوڑ آئے گا۔

یہی سوچ کر وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال کر نہانے چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

مہک جب اُٹھی تو آدھے صحن میں دھوپ آچکی تھی۔ دوائی کے زیر اثر اُس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔ اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے مہک جب اٹھی تو بے اختیار اپنے برابر میں نظر دوڑائی، مگر عادل وہاں موجود نہیں تھا۔

وہ آہستہ سے بستر سے اتری، اپنا دوپٹہ درست کیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر آتے ہی اس کی نظر شمیم اور عادل پر پڑی، جو برآمدے میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کچن سے ناشتے کی خوشبو آ رہی تھی، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ناشتہ تقریباً تیار ہو چکا ہو گا۔

مہک چل کر خاموشی سے ان دونوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"آپ دونوں نے مجھے اٹھایا ہی نہیں۔"

اس نے ہلکے سے شکوے بھرے انداز میں پہلے عادل کی طرف دیکھا، پھر شمیم کی طرف۔

شمیم نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ عادل بھی اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"رات تمہاری طبیعت کافی خراب تھی، اس لیے ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہیں جگائیں۔ آرام کی تمہیں سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

پھر نرمی سے بولیں۔

"اور ناشتہ بھی تیار ہے۔ جاؤ، پہلے ہاتھ منہ دھو لو، پھر سب مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔"
مہک نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆

جب وہ واپس آیا تو زہرہ ابھی تک گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ اس نے آہستگی سے اُسے آواز دی۔
"زہرہ... اٹھو، کچھ کھا لو۔"
زہرہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ وہ خاموشی سے اُٹھی، پاؤں میں چپل پہنی اور ہاتھ منہ دھونے واش روم چلی گئی۔
اتنی دیر میں سکینہ کھانا میز پر لگا چکی تھی۔
زہرہ آکر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ شاہد نے اُس کی پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا نکالا، مگر ابھی اُس نے دو تین نوالے ہی کھائے تھے کہ اُسے متلی آنے لگی۔ اُس نے فوراً کھانا ایک طرف رکھ دیا۔
شاہد نے پریشانی سے اُسے دیکھا، مگر کچھ نہیں بولا۔ زہرہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل چند نوالے اور کھائے، پھر مزید کھانا اُس کے لیے ممکن نہ رہا۔
شاہد نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"تیار ہو جاؤ زہرہ، میں تمہیں تمہارے میکے چھوڑ آتا ہوں۔ اتنی خراب حالت میں ہر وقت ایسے اندھیر کمرے میں قید رہنا تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔۔"
زہرہ نے سر اثبات میں ہلایا۔
زہرہ کی آنکھوں کے نیچے ہلکے نمایاں ہو چکے تھے۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں کی چمک جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ وہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں، دل و دماغ سے بھی بہت تھک چکی تھی۔ زندگی میں اس نے

کبھی اتنی تلخ باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ ایسے ماحول کی عادی نہیں تھی جہاں ہر دوسرے لمحے اُسے کسی نہ کسی بات پر طعنہ سننے کو ملے۔

شاہد کے کہنے پر وہ آہستہ سے کرسی سے اُٹھی۔ دوپٹہ دُرست کرتے ہوئے اُس نے بے اختیار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کل شام کی بنی ہوئی چوٹی اب کچھ بکھر چکی تھی، چند لٹیں نکل کر چہرے کے گرد بکھر گئی تھیں۔ اُس نے اُنہیں سمیٹا، پھر الماری کھول کر اپنی چادر نکالی اور خاموشی سے اُوڑھ لی۔

الماری میں اس کے کپڑے اور دوسری ضرورت کی چیزیں موجود تھیں، مگر اس نے ان میں سے کچھ بھی ساتھ رکھنے کی

ضرورت محسوس نہ کی۔ بس ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنی چند ضروری چیزیں رکھیں، دوائی رکھی اور بیگ بند کر دیا۔ آخر وہ اپنے ہی گھر جا رہی تھی، وہاں اس کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ نے کبھی اُسے کسی خواہش کے لیے

ترسنے نہیں دیا تھا۔ اُس کے منہ سے کسی چیز کا نام نکلتا اور وہ چیز اس کے سامنے موجود ہوتی۔

لیکن شادی کے بعد جیسے اُس کی زندگی کا ہر رنگ بدل گیا تھا۔ آزمائشیں اُس کے حصے میں کچھ اس طرح آئی تھیں کہ وہ خود بھی کبھی کبھی حیران رہ جاتی تھی۔ اب بس اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ چند دن اپنے گھر رہ کر سکون کا سانس لے، شاید کئی راتوں سے بچھڑی ہوئی نیند بھی اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔

جاتے ہوئے اس نے نجمہ کو سلام کیا، پھر نگینہ اور سکینہ کو بھی آہستہ سے سلام کیا۔

"سلام دینا سب کو وہاں۔ مجھے پہلے بتا دیا ہوتا تو میں تمہارے گھر والوں کے لیے کچھ بھجوا دیتی تمہارے ہاتھ۔ کیا سوچیں گے تمہارے میکے والے کے ہم اتنے کنجوس ہیں کچھ بھجوایا ہی نہیں۔" ایک ادا سے کہتیں نجمہ نے سر پر دپٹہ درست کیا۔

"کچھ نہیں ہوتاماں وہ بھلاایسی باتیں کیوں سوچیں گے ؟ہم جاتے ہوئے بازار میں سے کچھ لے جائیں گے۔"اپنی ماں کی بات سن کر شاہد نے کہا۔

"کیوں لے جاؤ گے بازار سے ؟میر امطلب ہے ایک تو بازار سے ہر چیز سونے کے داموں میں ملتی ہے اور اوپر سے ہوتی بھی کسی کام کی نہیں۔پیسے ضائع کرنے والی بات ہے لیکن اگر پھر بھی اگر کچھ لے کر جانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی۔۔"

"جی ٹھیک ہے۔دیکھ لیں گے ،اگر کچھ ڈھنگ کا نہ ہوا تو معذرت کر لیں گے۔"شاہد نے اپنی چوڑی کلائی پر پہنی گھڑی پر وقت دیکھا اور پھر زہرہ کو۔

"چلیں ؟"زہرہ نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔

"جی۔۔"اتنا کہہ کر ایک نظر اُس نے اپنی جانب گھورتی نجمہ کو دیکھا اور فوراً سے اپنی نظریں نیچے جھکا لیں۔

قریباًایک مہینے کے بعد وہ باغ را جارہی تھی۔پہلے ہی اپناموڈ وہ صبح خراب کر چکی تھی اب مزید کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ہینڈبیگ اُس نے اپنے کندھے پر لٹکار کھا تھا۔کپڑے کل والے ہی پہن رکھے تھے ،اُسے کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔سفید چادر سے اُس نے خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔کانوں میں سونے کے ٹاپس جو بچپن سے پہنے تھے ابھی تک وہی جھوم رہے تھے۔

اُس نے اب شاہد کا حلیہ دیکھا۔ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور وجیہہ نظر آنے والا شاہد آج بھی ویسا ہی تھا۔

گرے کلر کی شلوار قمیض پہنے۔بالوں کو نفاست سے سیٹ کیے وہ اچھا ہی لگ رہا تھا۔

داڑھی کی تراش خراش ہمیشہ کرواکے رکھا کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ ایک پرفیکٹ مرد لگ رہا تھا بنا کسی کمی کے۔ وہ دونوں گھر سے باہر نکل آئے تھے۔ سکینہ نے گھر کے باہری دروازے کو بند کیا اور ناشتے کے لیے کیچن میں چلی گئی۔ نجمہ اور نگینہ ابھی تک غصے سے صدر دروازے کو گھور رہی تھیں۔

"اس لڑکی سے جان ہی نہیں چھوٹ رہی اور پیسہ بھی ایک ڈھیلے کا نہیں مل رہا۔ کیا فائدہ ہوا شاہد کا اس سے بیاہ کروانے کا اگر گھر میں ایک پھوٹی کوڑی اس کے گھر والوں نے نہیں بھجوانی تھی تو۔" نخوت سے کہتیں نجمہ تن فن کرتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ آج شاید شاہد کے ابا بھی گھر آجائیں، وہ ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے اور مہینے میں ایک بار گھر ضرور آتے تھے۔ اس لیے اُنہیں اپنا موڈ ٹھیک کرنا تھا۔

"شاہد آپ مجھے واپس کب لینے آؤ گے؟" وہ راستے میں تھے جب زہرہ نے اُس سے سوال کیا۔

"لینڈ لائن پر کال کر کے بتا دینا کب لینے آؤں۔ جب کہو گی تب آجاؤں گا تمہیں لینے۔۔" چلتے چلتے وہ بس اسٹینڈ تک جا رہے تھے۔

"ایک دو ہفتے رہنے کا دل کر رہا ہے میرا وہاں۔۔ زہرہ نے سفید چادر اپنے اوپر اوڑھی ہوئی تھی۔ اُسے ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے شاہد کو دیکھا۔

"اچھا اتنی دیر وہاں رہو گی تو تمہاری یاد میں، میں نے بیمار ہو جانا ہے۔" شاہد نے بھی اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہد آپ نہیں ہونگے بیمار مجھے معلوم ہے۔" چلتے چلتے زہرہ نے کہا تو شاہد ہلکا سا مسکرا دیا۔

"چار پانچ دن بعد میں تمہیں لینے آؤں گا۔ بعد میں مجھے یہ مت کہنا کہ میں نے ابھی اور دن رہنا ہے پھر میں چھوڑنے نہیں جایا کرونگا آگے سے۔" شاہد اسے وارن کر رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔" اچھا کو گھسیٹ کر بولتے ہوئے زہرہ نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔

"جی آپ نے صحیح سُنا۔۔"شاہد نے اُسے مصنوعی تنبیہ کی جسے زہرہ نے ہنستے ہوئے اگنور کر دیا۔
"میری بات پر آپ ہنس کیوں رہی ہیں مسز شاہد؟ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں؟"شاہد نے مصنوعی خفت سے کہا۔
"اب میں ہنس بھی نہیں سکتی؟"زہرہ نے بھی اُسی کے انداز میں جواب دیا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ مسکرا نہیں سکتیں! میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ میری بات سُن کر کیوں مسکرا رہی ہیں؟"شاہد نے اُس سے پوچھا تو وہ خاموش ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔
شاہد نے اپنی بھنو کو اُٹھا کر اُس سے دریافت کیا۔
"اپنے شوہر کی بات سُن کر مسکرانا گناہ کی بات ہے؟"زہرہ کی بات سُن کر شاہد کی آنکھوں میں تعجب اُبھرا۔
" صحیح کہا آپ نے بیگم۔ شوہر کی بات سن کر مسکرانا چاہیے۔ ہم ہی تو ہیں آپ کے شوہر۔"شاہد کو مزہ آرہا تھا زہرہ سے بات کر کے۔
اتنی دیر وہ وہاں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے والے تھے اور ساتھ میں باتیں۔۔
وہ دونوں بس اسٹاپ کے پاس آچکے تھے، تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک بس نے آجانا تھا۔ ابھی آٹھ بج کر بیس منٹ ہی تو ہوئے تھے۔
"اچھا تو زہرہ، آپ کی جو سہیلی ہے... کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا؟"
شاہد نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کنپٹی پر انگلی رکھی، جیسے یادداشت کے کسی دھندلے گوشے میں وہ نام تلاش کر رہا ہو۔
زہرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا، پھر بے ساختہ بولی۔

"میری دوست کا نام۔۔۔ مہک ہے۔"

"نہیں۔۔۔ مہک تو آپ کی وہ والی دوست ہے نا، جس سے بس سلام دعا ہے۔ میں اُس کی نہیں، آپ کی اُس سب سے پکی سہیلی کی بات کر رہا ہوں جس سے آپ کی سب سے زیادہ پکی دوستی ہے۔"

شاہد نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی، "کیا نام بتایا تھا تم نے اُس کا۔۔۔؟"

زہرہ نے ایک دم خوشی سے کہا، "اچھا۔۔ اچھا۔۔۔ آپ محمل کی بات کر رہے ہیں!"

"ہاں، شاید وہی۔"

"وہ تو میری کلاس فیلو بھی تھی، اور بچپن سے میری سب سے اچھی دوست بھی۔ گاؤں میں اگر میری کسی سے سب سے زیادہ بنتی تھی تو وہ محمل ہی تھی۔"

شاہد ہلکا سا مسکرایا۔

"تو پھر جب تم میکے جاؤ گی، سب سے پہلے اُسی سے ملنے جاؤ گی؟"

زہرہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں جی۔۔۔! سب سے پہلے تو میں امّی سے ملوں گی۔ پھر گھر میں جو سب لوگ ہیں، اُن سے۔ اور محمل ۔۔۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اُسے تو جیسے ہی خبر ملے گی کہ زہرہ سسرال سے میکے آئی ہے، وہ خود ہی بھاگی چلی آئے گی۔ پھر ہم دونوں بیٹھ کر اتنی گپ شپ کریں گے کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔"

"اچھا... تو مطلب آپ اسے یہ بھی بتاؤ گی کہ میرا شوہر میرے ساتھ کیسا ہے؟" شاہد نے ابرو اچکاتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"یعنی میری برائیاں بھی کروگی؟ یہ بھی بتاؤ گی کہ میرا شوہر میرے ساتھ یہ نہیں کرتا، وہ نہیں کرتا...

بالکل اُن بیگمات کی طرح جو اپنی سہیلیوں کے سامنے بیٹھ کر اپنے شوہروں کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتی

ہیں، جیسے اُن کی دوست نے ہی

سارے مسئلے حل کر دینے ہوں۔"

زہرہ نے ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی۔

"کیوں؟" شاہد نے شرارت سے پوچھا۔

"اچھا تو آپ کو لگتا ہے کہ میں ایسی ہوں؟" خفت سے کہتی زہرہ اپنا موڑ گئی۔

شاہد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فوراً صفائی دی۔

"ارے نہیں، نہیں، نہیں! میں نے ایسا کب کہا؟ میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ آپ لوگ شادی بیاہ کی

باتیں کروگی۔ فلاں کی منگنی، ڈھمکاں کا رشتہ، کون کب شادی کرے گا۔۔۔ بس یہی سب۔"

زہرہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"اللہ کے بندے! ہم لڑکیاں صرف شادیوں کی ہی بات نہیں کرتیں۔"

شاہد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"اچھا؟ تو پھر باقی وقت کس چیز پر گزارتی ہو؟"

"ہر چیز پر!" جواب فوراً سے آیا تھا۔

"ہر چیز؟" شاہد نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، ہر چیز۔"

شاہد نے بے بسی سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میری سمجھ سے باہر ہے! آخر وہ کون ساٹاپک ہوتا ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا؟ ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع، دوسری ختم نہیں ہوتی کہ تیسری حاضر۔ مجھے تو لگتا ہے آپ لوگوں کے پاس باتوں کا کوئی خفیہ گودام ہے، جہاں سے نئی نئی باتیں سپلائی ہوتی رہتی ہیں۔ ورنہ دو لڑکیاں بیٹھ کر تین تین گھنٹے آخر کرتی کیا ہیں؟"

زہرہ نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"ہماری چھوڑیں آپ اپنی بتائیں۔"

شاہد نے فخر سے سینہ چوڑا کیا۔

"ہم؟ ہم تو پانچ منٹ میں پوری دنیا کے مسائل حل کر کے اُٹھ جاتے ہیں۔"

"ہاں، کیونکہ چھٹے منٹ تک آپکے پاس بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

شاہد نے منہ بنایا۔

"بات ختم نہیں ہوتی۔۔۔ اسٹاک ختم ہو جاتا ہے!" سانس لے کر وہ پھر سے بولا۔

"باتوں کا اسٹاک تو آپ لوگوں کے پاس کبھی ختم نہیں ہوتا۔" شاہد نے دونوں ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے کہا۔ اُس کی بات سُن کر زہرہ بولی۔

"دیکھو نا، پہلے آپ نے کہا تم لوگ شادی بیاہ کی باتیں کرو گی، پھر آپ نے خود ہی اس میں اپنی میری برائیاں، سسرال کے ظلم و ستم، شوہروں کی شکایتیں اور نہ جانے کیا کیا شامل کر دیا۔ اب دیکھو، کہاں سے کہاں پہنچ گئی بات! کبھی کبھی تو مجھے
واقعی آپ لڑکوں کی سمجھ نہیں آتی۔"

زہرہ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا، مگر جواب دینے سے پہلے ہی شاہد ہنس پڑا۔

"بس! یہی تو کہہ رہا ہوں۔ میں نے اتنی سی سیدھی سادی بات کی تھی کہ اگر آپ کی جگہ کوئی لڑکا کھڑا ہوتا تو 'ہاں' کہہ کر آگے بڑھ جاتا۔ لیکن آپ۔۔۔ آپ تو لڑکی ہو۔ آپ لوگوں کو تو ایک جواب میں بھی دس نئے سوال مل جاتے ہیں۔"

اس نے ڈرامائی انداز میں آہ بھری۔

"اب دیکھنا، اسی ایک بات پر آپ مجھ سے اگلے چار گھنٹے بحث کرو گی۔ پھر کہو گی، 'اچھا، یہ بتائیں، ایسا کیوں کہا؟' پھر 'وہ کیوں کہا؟' پھر 'اس کا مطلب کیا تھا؟' اور آخر میں فیصلہ یہ ہو گا کہ غلطی میری ہی تھی۔"

زہرہ بے اختیار ہنس پڑی۔

شاہد نے فاتحانہ انداز میں انگلی اٹھائی۔

"دیکھا؟ ابھی تو ہنسی آ رہی ہے، پانچ منٹ بعد یہی گفتگو جنگ کا میدان بن جائے گی۔"

وہ ذرا جھکا اور مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

ہم لڑکے بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ دو منٹ کرکٹ، دو منٹ موٹر سائیکل، ایک منٹ 'چلتے ہیں'۔۔۔ اور "بات ختم۔

پھر زہرہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"اور آپ لوگ؟ 'چلتی ہوں' کہنے کے بعد بھی آدھا گھنٹہ دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں کرتی رہتی" ہو۔

شاہد کی بات سن کر زہرہ نے خفگی سے اسے گھورا۔

"شاہد! اب آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ اب تو جان بوجھ کر ہمیں روسٹ کر رہے ہیں۔ ہم اتنی بھی باتیں نہیں کرتے، جتنی آپ بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

شاہد نے ڈرامائی انداز میں اپنا ہاتھ دل پر رکھا اور ایک لمبی آہ بھری۔

"اچھاااا! تو اب آپ یہ بھی کہو گی کہ لڑکیاں کم بولتی ہیں؟ زہرہ، اتنا بڑا جھوٹ بولنے سے پہلے کم از کم خدا کا خوف ہی لیا

کرو۔"

زہرہ نے ہونٹ بھینچے تاکہ ہنسی نہ نکل جائے، مگر اس کی ہنسی زیادہ کنٹرول نہ ہو سکی۔

شاہد نے فوراً انگلی اٹھائی۔

"دیکھا! ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ ہم لوگ زیادہ باتیں نہیں کرتیں، اور اب آپ دماغ میں مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے دس نئی دلیلیں لائن میں کھڑی ہوں گی۔"

زہرہ نے بازو باندھ کر مصنوعی غصے سے کہا۔

"ہاں تو؟ دلیلیں دینا اچھی بات ہوتی ہے۔"

"بالکل!" شاہد نے فوراً سر ہلایا۔

"لیکن آپ لوگوں کی دلیلیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ بندہ ایک سوال پوچھے، جواب کے ساتھ بونس میں پانچ نئے سوال بھی مل جاتے ہیں۔"

زہرہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"آپ سے بحث کرنا ہی فضول ہے!"

شاہد فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔

"دیکھا؟ آخر میں یہی جملہ آتا ہے۔ مطلب بحث ختم نہیں ہوتی۔۔۔ صرف آپ لوگ اعلان کر دیتے ہو کہ 'آپ سے بات ہی نہیں کرنی!" زہرہ نے دونوں بازو سینے پر باندھے اور مصنوعی ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اچھا؟ تب سے آپ ایک ہی بات کیے جا رہے ہیں کہ 'تم لڑکیاں بہت بولتی ہو، بہت بولتی ہو۔' ذرا اپنا بھی حساب کر لیں۔ اتنی دیر سے مسلسل آپ بول رہے ہیں، میں تو صرف بیچ بیچ میں دو چار جملے بول رہی ہوں۔ پھر آپ کیسے ثابت کریں گے کہ زیادہ باتیں لڑکیاں کرتی ہیں؟ آپ بھی تو کم نہیں بولتے!"

شاہد نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں، پھر آسمان کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"اللہ... اللہ... اللہ! کیسی لڑکی ہے یہ! اپنے شوہر کو بھی نہیں بخش رہی۔ توبہ توبہ... کیا زمانہ آگیا ہے۔"

اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتا وہ ڈرامائی انداز میں سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولا۔

"کل کو لوگ پوچھیں گے، 'بھائی، شادی کے بعد کیا حال احوال ہیں؟' اور میں کہوں گا، 'بھئی، گھر میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔ دلیلیں بھی سنتا ہوں، لیکچر بھی، اور آخر میں قصور بھی میرا ہی نکلتا ہے!"

زہرہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"قصور آپ کا نہیں ہو گا تو کیا میرا ہو گا؟"

شاہد نے فوراً سینے پر ہاتھ رکھا۔

"دیکھا؟ ہمیں تو کل بھی انتظار نہیں کرنا پڑا، وکیل صاحبہ نے فیصلہ بھی سنا دیا اور مجرم بھی مجھے بنا دیا اور وہ بھی آج کے آج۔"

وہ دونوں ابھی ایک دوسرے کی باتوں پر مسکرا ہی رہے تھے کہ اچانک بس کا تیز ہارن فضا میں گونجا۔
دونوں نے بیک وقت چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔
دور سے آتی بس آہستہ آہستہ اسٹینڈ پر آکر رکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو شاہد نے پہلے زہرہ کو بس میں چڑھنے کا اشارہ
کیا۔ زہرہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ گئی، شاہد بھی اس کے پیچھے بس میں سوار ہو گیا۔
دونوں نے کھڑکی والی نشست سنبھال لی۔ ان کی منزل باغرا تھی، جہاں پہنچنے میں تقریباً دو گھنٹے لگنے تھے۔ بس نے ایک جھٹکے سے اسٹینڈ چھوڑا اور آہستہ آہستہ سڑک پر دوڑنے لگی، جبکہ کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا ان کی ادھوری گفتگو کو اپنے ساتھ کہیں دور لے جا رہی تھی۔ وہ اب خاموشی سے بس کا سفر کر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

ڈائننگ ٹیبل پر وہ تینوں خاموشی سے بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ تینوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پورے گھر میں پِن ڈراپ سائلنس چھائی ہوئی تھی۔ صرف پنکھے کی مدھم آواز آ رہی تھی، جس سے دیوار کے ساتھ لگے دیوار گیر پردے ہلکے ہلکے لہرا رہے تھے۔
مہک نے پہلے شمیم کی طرف دیکھا، پھر عادل کی جانب۔
"آپ دونوں نے ناشتہ کر لیا؟ اگر ہو گیا ہے تو میں چائے کپوں میں ڈال کر لے آؤں؟"
اس کی آواز پر دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔
"ہاں بیٹا، لے آؤ۔" شمیم نے نرمی سے کہا۔

"ہاں مہک، لے آؤ۔" عادل نے بھی اثبات میں سر ہلایا، پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا، وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"مجھے بھی ابھی ہسپتال جانا ہے۔ آج کمال کو دوسرے ہسپتال شفٹ کرنا ہے۔ وہاں کی ساری کارروائی بھی مکمل کرنی ہے، اس لیے اگر میں جلدی نکل جاؤں تو بہتر رہے گا۔"

یہ کہہ کر وہ دوبارہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا، جبکہ مہک خاموشی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا سوچا ہے، بیٹا؟ اب کمال کو کس ہسپتال میں داخل کرو گے؟" شمیم نے افسردگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور تمہیں کیا لگتا ہے۔۔۔ کیا وہ کبھی ٹھیک ہو پائے گا؟"

ان کی آواز میں چھپی بے بسی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

عادل نے ایک لمحے کے لیے ان کی طرف دیکھا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"جی خالہ، آپ امید رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ ان شاء اللہ وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آج اسے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں منتقل کر رہا ہوں۔ وہاں علاج بھی بہتر ہو گا۔ اللہ نے چاہا تو وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ آپ بس اس کے لیے دعا کرتی رہیے۔"

اتنا کہہ کر اس نے دوبارہ خاموشی سے نوالہ توڑ لیا۔

شمیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ شاید وہ خود کو یہی تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

دونوں دوبارہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔

چند لمحوں بعد مہک ٹرے میں تین کپ چائے نفاست سے سجا کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف آگئی۔ اس نے ایک ایک کپ ان کے سامنے رکھا، مگر دونوں کے چہروں پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کیا ہوا؟" اس نے پریشانی سے دونوں کو دیکھا۔

"آپ دونوں اتنے خاموش کیوں ہیں؟ کمال ٹھیک ہے نا؟ سب خیریت تو ہے؟"

"ہاں مہک، سب ٹھیک ہے۔" عادل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں آج دو بجے تک ہسپتال سے واپس آجاؤں گا۔ آج میں نے آفس سے چھٹی لے لی ہے، اپنے باس کو ای میل بھی بھیج دی ہے۔ تم دو بجے تک تیار رہنا، میں آتے ہی تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر سے دوبارہ اپائنٹمنٹ بھی لے لی ہے۔"

پھر اس نے رخ شمیم کی طرف کیا۔

"اور خالہ، آپ بالکل فکر نہ کریں۔ جس ہسپتال میں کمال کو منتقل کر رہا ہوں، وہاں نرسز کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ اب اس کے پاس دن رات کسی کے بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ آپ جب دل چاہے، دن میں ایک یا دو بار جا کر اس سے مل آیا کریں۔ لیکن اپنی طبیعت کا بھی خیال رکھیے گا۔ ایسا نہ ہو کہ بار بار آنے جانے سے آپ خود بیمار پڑ جائیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے ٹرے میں رکھا کپ اٹھایا اور چائے پر آہستہ آہستہ پھونکیں مارتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا۔

شمیم نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا کپ اٹھالیا۔

مہک بھی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار رہو نگی۔ لیکن مجھے فون کر کے حالات سے آگاہ کرتے رہیے گا۔ کم از کم دل کو تسلی رہے گی کہ وہاں سب خیر ہے۔ اور کمال بھی ٹھیک ہے۔"

عادل جو خاموشی سے چائے کے سپ لے رہا تھا مہک کی بات سنتا سر ہلا گیا۔ اور پھر شمیم کی طرف دیکھ کر نرمی سے بولا۔

"اور خالہ۔۔۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔ اگر آپ ہمت ہار جائیں گی تو کمال کو حوصلہ کون دے گا؟"

یہ کہہ کر اس نے بھی خاموشی سے مہک کا جائزہ لیا وہ بھی اب چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

ایک بار پھر ڈائننگ ٹیبل پر خاموشی اتر آئی۔

انسان کی زندگی ہمیشہ اُس راستے پر نہیں چلتی جس کا وہ تصور کرتا ہے۔ چند ماہ پہلے تک ان تینوں نے بھی اپنی زندگیوں کے لیے نہ جانے کتنے حسین خواب سجا رکھے تھے۔ مگر ہر خواب کی تعبیر انسان کے اختیار میں کہاں ہوتی ہے؟ بعض فیصلے آسمان پر لکھے جا چکے ہوتے ہیں، جنہیں نہ خواہشیں بدل سکتی ہیں اور نہ تدبیریں۔

وہ دونوں خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھیں۔ انہیں ذرّہ برابر اندازہ نہیں تھا کہ گزشتہ روز جلال اور شہیر نے عادل سے کیا گفتگو کی تھی۔

مگر عادل۔۔۔ وہ سب جانتا تھا۔

وہ شہیر کے ارادوں سے بھی واقف تھا اور اس کے منصوبوں سے بھی۔ اسی لیے وہ خاموشی سے ہر چال کا توڑ سوچ رہا تھا، ہر ممکن تدبیر کر رہا تھا۔

لیکن تدبیریں انسان بناتا ہے، فیصلے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

آخر کار ہوتا ہمیشہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں لکھا ہو۔ انسان چاہے کتنے ہی منصوبے بنا لے، تقدیر اپنی راہ خود چنتی ہے۔

جب اس کا ناشتہ مکمل ہوا تو وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا، سب کو سلام کیا، اپنی ضروری چیزیں سنبھالیں اور ہسپتال کے لیے روانہ ہو گیا۔

گھر میں اب صرف شمیم اور مہک رہ گئی تھیں۔ دن ان کے لیے ہمیشہ کی طرح معمول کے مطابق گزرنے لگا۔ وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہیں اور ہر لمحہ کمال کی صحت یابی کے لیے دعا کرتی رہیں۔ ان کی دنیا کمال کے گرد ہی گھومتی تھی۔ انہیں اپنی زندگی میں اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کی خواہش نہ تھی۔ ان کے لیے سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ کمال جلد از جلد مکمل صحت یاب ہو جائے، کیونکہ اس کی سلامتی اور تندرستی ہی ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھی۔

تقریباً آدھے پونے گھنٹے بعد عادل ہسپتال پہنچ گیا۔ تمام ضروری دستاویزات مکمل کرنے اور کمال کو دوسرے ہسپتال منتقل

کروانے میں اسے تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ صبح کے دس بج چکے تھے جب وہ کمال کے ساتھ نئے ہسپتال میں موجود تھا۔

کمال کو وہیل چیئر پر بٹھایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ کسی بے جان وجود کی طرح خاموش بیٹھا سامنے کسی انجانی سمت میں نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اردگرد کیا ہو رہا تھا، کون آ رہا تھا، کون جا رہا تھا، اسے کسی بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

عادل ڈاکٹر سے اس کی حالت اور علاج کے بارے میں مختلف باتیں کرتا رہا، مگر کمال کی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی

طرف نہ گئی۔ وہ اپنے ہی خیالوں کی ایسی گہری وادی میں گم تھا جہاں کسی آواز کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ کیا محبت کا نہ ملنا انسان کو واقعی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے؟ کیا دل کی سب سے بڑی خواہش ٹوٹ جائے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ماند پڑ جاتی ہے؟ کیا انسان زندہ تو رہتا ہے، مگر اس کی روح کہیں پیچھے رہ جاتی ہے؟

شاید ہاں۔۔۔ کیونکہ اس وقت کمال کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ سانس تو لے رہا تھا، مگر جینے کی تمام خواہشیں جیسے اس کے وجود سے رخصت ہو چکی تھیں۔

کون تھی وہ لڑکی؟

آخر کون تھی وہ لڑکی جس کی موت نے کمال کی زندگی کا ہر رنگ چھین لیا تھا؟ وہ کون تھی جس کے بچھڑنے کے بعد کمال کی ہنسی، اس کی باتیں، اس کی زندگی سب کہیں گم ہو گئی تھیں؟ وہ اتنا خاموش کیوں ہو گیا تھا؟ اس کی یاد میں اس قدر بے چین اور بے قرار کیوں تھا؟ اسے نہ کھانے کی فکر تھی، نہ پینے کی، نہ اپنی زندگی کی۔

وہ لڑکی آخر کیوں مر گئی تھی؟

اور اگر وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی تو پھر کمال کو اس کی قبر پر جانے سے کیوں روکا جا رہا تھا؟ زندہ لوگوں کے لیے تڑپنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر کیا مر جانے والوں سے ملنے کی خواہش بھی جرم بن جاتی ہے؟ کیا قبر پر جا کر چند آنسو بہا لینے سے بھی کسی کو محروم کیا جا سکتا ہے؟

کمال اپنی ماں سے التجا کرتا، بہن سے منت کرتا، دوست کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتا، مگر کوئی بھی اسے اس کی آخری منزل تک لے جانے کو تیار نہ تھا۔ کیا یہی محبت تھی؟ کیا یہی اپنائیت تھی کہ وہ

اس کے دل میں اٹھنے والے طوفان، اس کے دکھ، اس کی بے بسی اور اس کے رنج کو محسوس ہی نہ کر سکے ؟

آخر یہ کیسا زخم تھا جو وقت گزرنے کے باوجود بھرنے کے بجائے اور گہرا ہوتا جارہا تھا؟ کیسا درد تھا جو کمال کے دل میں اس طرح پیوست ہو چکا تھا کہ اب اس کی ہر سانس بھی اسی کا نوحہ سنائی دیتی تھی ؟

کمال بدستور خاموشی سے کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہا تھا۔ اس کی نظریں کہیں دور جمی ہوئی تھیں، جیسے ارد گرد کی ہر آواز

اس تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہو۔

ادھر عادل ڈاکٹر کے قریب آیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب، اس کا نام کمال نہیں۔۔۔ ریکارڈ میں ذریاب خان لکھ دیجیے۔ اور ایک گزارش ہے، کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے علاج، آپریشن یا ادویات کے تمام اخراجات کون برداشت کر رہا ہے۔ یہ بات جتنی خفیہ رہے، اتنا ہی بہتر ہو گا۔"

ڈاکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو عادل نے سنجیدہ لہجے میں مزید کہا۔

"اس کی جان کو خطرہ ہے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اور میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی ذریعے سے انہیں اس کے یہاں موجود ہونے کی خبر ملے۔"

ڈاکٹر نے مختصراً سر ہلایا۔

ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اس طرح انتظامات کرنے اور ریکارڈ خفیہ رکھنے پر اخراجات معمول سے زیادہ ہوں گے۔"

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پہلے وہیل چیئر پر بے حس و حرکت بیٹھے کمال کو دیکھا، پھر نظریں عادل کی طرف موڑ دیں۔

عادل نے بلا جھجھک جواب دیا۔

"پیسوں کی آپ فکر نہ کریں، ڈاکٹر صاحب۔ جتنا خرچ آئے گا، ہم ادا کریں گے۔ بس ایک بات کا خاص خیال رکھیے... یہ خبر کسی صورت ہسپتال کی چار دیواری سے باہر نہیں جانی چاہیے کہ کمال، یا یوں کہیے ذریاب خان، یہاں زیرِ علاج ہے۔" ڈاکٹر نے سر اثبات میں ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد کمال کو ہسپتال کے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور اس کا علاج دوبارہ سے شروع ہو گیا تھا، لیکن علاج کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ تر بے ہوش ہی رہتا تھا۔ اسے اپنی تکلیف، اپنے درد، اپنے زخموں یا اپنی حالت سے کسی قسم کی کوئی غرض نہیں رہی تھی۔

اس کے ذہن میں صرف ایک ہی چیز چل رہی تھی، اور وہ تھی وہ لڑکی۔۔۔

وہ لمبے بالوں والی لڑکی۔ سیاہ آنکھوں والی، جس کی محبت میں وہ اپنا سکون تک کھو چکا تھا۔ جس کی موت نے اس کی پوری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ اس کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی، بدتر ہو چکی تھی۔ بھلا موت کے بعد بھی کوئی کسی کے حواسوں پر اتنا سوار ہو سکتا ہے؟

وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں سانس لینا بھی اس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ اسے اب سانس لینے سے زیادہ اپنی موت عزیز لگنے لگی تھی۔ جیسے زندگی سے اس کا ہر رشتہ ختم ہو چکا ہو، اور اب وہ صرف ایک ختم نہ ہونے والی اذیت جھیل رہا ہو۔

اسے کمرے میں شفٹ کیے جانے کے بعد جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو عادل ڈاکٹر کی طرف بڑھا۔

"ڈاکٹر صاحب، میں روزانہ ایک بار ضرور آؤں گا۔ کبھی کبھار اس کی امی اور اس کی بہن بھی اس سے ملنے آیا کریں گی۔ میں ابھی آپ کو ان دونوں کے نام لکھوا دیتا ہوں، صرف انہی کو کمال سے ملنے کی اجازت ہو گی۔"

"اس کے علاوہ اگر کوئی بھی شخص آئے، چاہے وہ اپنا کتنا ہی قریبی ہونے کا دعویٰ کرے، میری اجازت کے بغیر اسے کمال سے ہرگز مت ملنے دیجیے گا۔

اگر آپ میری یہ بات مان لیں تو یہ میرے لیے بہت بڑا احسان ہو گا۔"

"ارے عادل صاحب، آپ بے فکر ہو جائیں۔ بس آپ ہماری روٹی پانی کا انتظام کرتے رہیے، ہم آپ کی ہر بات پر عمل کرتے رہیں گے۔ نہ آپ کو کسی قسم کی کوئی پریشانی ہو گی اور نہ ہی کمال کو۔ اور جہاں تک کمال کی صحت کا تعلق ہے، ہم پوری کوشش کریں گے کہ اسے جتنی جلدی ممکن ہو سکے، صحت یاب کر دیں۔ بس آپ ہمارا خیال رکھیے، ہم کمال کا خیال رکھیں گے۔"

ڈاکٹر نے چہرے پر ایک مصنوعی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ عادل کو وہ ڈاکٹر ایک نظر بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

عادل نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا، ڈاکٹر سے سلام کیا اور اسپتال کی طویل راہداری عبور کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

ادھر کمال اپنے بیڈ پر تنہا لیٹا تھا۔ اس کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں، مگر اس کا ذہن کہیں بہت دور بھٹک رہا تھا۔ وہ اپنی ہی یادوں میں گم تھا۔۔۔ ان یادوں میں جو کبھی اس کی زندگی کے سب سے حسین لمحے ہوا کرتے تھے، مگر آج صرف ایک اذیت بن کر اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

تقریباً صبح کے ساڑھے دس بجے کا وقت تھا جب وہ دونوں باغرا میں اُترے تھے۔ بس باغرا کے بس اسٹاپ پر رکی تھی اور وہ دونوں وہاں اتر آئے تھے۔ پورے ایک مہینے بعد وہ دوبارہ باغرا واپس آئی تھی۔

وہاں کی پاکیزہ ہوا، پرسکون فضا اور مانوس ماحول نے اسے عجیب سا سکون محسوس کروایا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور اس فضا کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کی نظریں انہی سڑکوں پر جا ٹھہریں۔ یہ وہی راستے تھے، وہی گلیاں تھیں، وہی منظر تھے۔۔۔ جو اپنے ساتھ بے شمار تلخ یادیں لیے کھڑے تھے۔ وہ یادیں جو اس کے دل کو تکلیف دے رہی تھیں۔

وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ آخر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جب بھی وہ اپنے ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی، اس کے سر میں شدید درد اٹھنے لگتا۔ اسی وجہ سے اس نے مزید سوچنے کے بجائے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک بار پھر لمبا سانس اندر کھینچا اور اس پاکیزہ فضا کو اپنے وجود میں سمو لینے کی کوشش کرنے لگی۔

" لیجیے بیگم صاحبہ، آگیا آپ کا باغرا۔۔۔ آپ کا گاؤں، آپ کے اپنے لوگ، آپ کا محفوظ ٹھکانہ، اور آپ کی حسین یادوں کی وہ دنیا جسے آپ ہر روز یاد کرتی تھیں۔ اب یہاں اپنی امی سے ملیے، اپنی سہیلیوں سے ملیے، گھر والوں کے ساتھ وقت گزاریے، خوب خوش رہیے۔۔۔ اور ہاں، اپنی طبیعت کا خاص خیال رکھیے گا۔ "

شاہد کی بات ختم ہوئی تو زہرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

" ایک منٹ۔۔۔ کیا آپ میرے ساتھ گھر نہیں چل رہے ؟ "

اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ استعجاب سے اُس نے شاہد کو دیکھا تھا۔

شاہد نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

نہیں، میں یہیں سے واپس اپنے کام پر چلا جاؤں گا۔ میں تو صرف تمہیں بخیریت یہاں تک چھوڑنے آیا" "تھا۔

زہرہ کے چہرے پر فوراً پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔

"لیکن اگر آپ مجھے چھوڑنے آئے ہیں تو کم از کم گھر تک تو چلیں۔ امی پوچھیں گی، اور جلال بھائی یاں چچا کے گھر سے کوئی بھی آیا تو وہ سب پوچھیں گے آپ کے بارے میں۔۔ میں انہیں کیا جواب دوں گی؟ یہی کہ آپ مجھے سڑک کے بیچوں بیچ چھوڑ کر واپس چلے گئے؟ پلیز۔۔۔ میرے ساتھ چلیں نا۔"

وہ اس سے ایسے اصرار کر رہی تھی کہ جیسے اس کے انکار کی گنجائش ہی نہ ہو۔

شاہد نے ایک لمحہ اسے دیکھا، پھر ہار مانتے ہوئے بولا۔۔

"اچھا، اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے، چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی یہاں اتنا پینک کریئیٹ کرو۔ آؤ، چلتے ہیں۔"

زہرہ نے سکون کا سانس لیا۔

ان کے پاس ویسے بھی کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ بس دونوں آہستہ آہستہ کچی سڑک پر قدم بڑھانے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف لہلہاتے کھیت اپنی سرسبزی بکھیر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے فصلوں کو لہراتے ہوئے گزر رہے تھے، پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول کو مزید دلکش بنا رہی تھی، اور ایک مہینے بعد اپنے گاؤں کی اس پاکیزہ فضا میں سانس لیتے ہوئے زہرہ کے دل پر چھایا ہر بوجھ جیسے آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا۔ شاہد خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہا تھا، جبکہ وہ ہر چند قدم

بعد اپنے ارد گرد نظریں دوڑا کر اپنے گاؤں کی خوبصورتی کو ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے برسوں بعد لوٹی ہو۔

وہ دونوں گھر پہنچ چکے تھے۔

سرخ اینٹوں سے بنی وہ وسیع و عریض حویلی ہمیشہ کی طرح اپنی پوری شان کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ داخلی دروازے سے اندر آتے ہی دونوں جانب قطار میں کھلے رنگ برنگے پھول اپنی خوشبو بکھیر رہے تھے، جبکہ سرخ اینٹوں سے بنی لمبی سی پگڈنڈی سیدھی گھر کے مرکزی دروازے تک جا رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے ایک کشادہ ہال تھا اور بائیں جانب بنی چوڑی سیڑھیاں دوسرے فلور کی طرف جا رہی تھیں۔ پورے گھر میں ایک عجیب سا سکون اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

گھر میں اس وقت صرف رضیہ بیگم موجود تھیں، جبکہ چند ملازمائیں روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھیں۔

زہرہ نے جیسے ہی گھر کے اندر قدم رکھا، اس کی خوشی قابو میں نہ رہ سکی۔ اس نے بلند آواز میں پکارا۔

"امی۔۔۔ السلام علیکم! کہاں ہیں آپ؟ امی۔۔ کوئی ہے؟"

اس کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی۔

شاہد نے اسے مسلسل آوازیں لگاتے دیکھا تو ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے ارے۔۔ ذرا صبر بھی کر لو۔ آ جائیں گی، کہیں بھاگی تو نہیں جا رہیں۔"

زہرہ نے شرارتی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا، پھر جلدی سے بولی۔

"آئیں۔۔۔ امی کے کمرے میں چل کر دیکھتے ہیں۔ وہ یقیناً وہیں ہوں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے رضیہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جبکہ شاہد بھی مسکراتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔

تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کا ٹکراؤ جلال سے ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اُس کا پاؤں پھسلا تھا۔ جلال نے پھرتی سے اُسکی کلائی تھام لی۔

اسی لمحے گھبراہٹ میں اس کی نظر پیچھے کھڑے شاہد پر پڑی، جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر خاموشی سے کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

شاہد کی نگاہ سب سے پہلے زہرہ کی کلائی پر گئی، جو اب بھی جلال کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے۔ اس کے دل میں ایک انجانی سی چبھن اُٹھی تھی، اور یہ اُسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

دوسری طرف جلال کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز، شیطانی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے لبوں کا ایک کنارا ہلکا سا اوپر اٹھایا، جبکہ اس کی آنکھوں سے غرور اور نخوت صاف جھلک رہی تھی، جیسے وہ جان بوجھ کر شاہد کے دل میں آگ لگانا چاہتا ہو۔

زہرہ نے بھی شاہد کی نظریں محسوس کرلی تھیں۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے جھٹکے سے اپنی کلائی جلال کے ہاتھ سے چھڑوالی اور ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"ج۔۔ جلال بھائی! آپ۔۔۔ آپ یہاں؟"

اس کی آواز میں حیرت بھی تھی اور بے چینی بھی۔

کلائی آزاد کرتے ہی وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور سیدھی جا کر شاہد کے قریب کھڑی ہو گئی۔

جلال نے دونوں کو ایک نظر دیکھا، پھر بڑے اطمینان سے بولا۔

ہاں۔۔۔اب یہ ہمارا بھی تو گھر ہے۔ آخر ہم سب نے یہیں رہنا ہے۔ تائی اماں کو ہم یہاں اکیلا کیسے چھوڑ "
"سکتے تھے؟

جلال کی بات سن کر زہرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ اس نے پہلے جلال کو دیکھا، پھر خاموش کھڑے شاہد کی طرف نظر دوڑائی۔

"لیکن۔۔۔ماں کے ساتھ تو یہاں آپا بھی رہتی ہیں۔"

اس کی بات مکمل ہوتے ہی جلال فوراً بولا۔

ہاں، رہتی تو ہیں۔۔۔ مگر وہ تائی اماں کا ویسا خیال کہاں رکھ سکتی ہیں، جیسا ہم، ان کے اپنے، رکھ سکتے "
"ہیں۔

"اچھے اخلاق رکھنے والا غیروں میں بھی اپنائیت ڈھونڈ لیتا ہے اور بُرے اخاق والا اپنوں میں بھی غیر لگتا ہے۔ جہاں تک میں آپ کو جانتی ہوں آپ دوسرے لوگوں کی کیٹیگری میں آتے ہیں۔" زہرہ کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اُسے جلال کا چہرہ ساڑھے چار ماہ بعد دیکھ کر وہ تھپڑ یاد آیا تھا، جو پوری شدت کے ساتھ اُس کے منہ پر مارا گیا تھا۔ وہ کونسا صرف جسمانی تشدد تھا؟ وہ تو ذہنی اذیت بھی تھی، جذبات کا خون بھی تھا۔

"زہرہ چلیں؟" اُسے جلال کے ساتھ اُلجھتا دیکھ شاہد نے اُس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ غصے سے اُس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔

شاہد کی آواز نے اُسے ماضی سے واپس کھینچا تھا۔

زہرہ نے اُس کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے اُس کے ساتھ چلنے لگی۔ اُس نے جلال کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا۔

جلال اپنی مٹھیاں بھینچے دانتوں کو پیستا اُن کے جانے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا۔ نجانے کتنی دیر، کتنے لمحے

۔۔

"امی۔۔۔۔" اُس نے بر آمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر ایک بار پھر رضیہ کو آواز لگائی۔

"زہرہ کمرے میں جا کر ملو۔ ایسے آوازیں دینا اچھا نہیں لگتا بار بار۔۔" اُسے ایک پھر آوازیں دیتے ہوئے شاہد نے ٹوکا۔

"جی آجائیں امی کے کمرے میں ہی چلتے ہیں سیدھا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ شاہد نے بھی ہلکی

سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھائے۔

اگلی منزل کی طرف اس کے ایسے قدم ڈھل رہے تھے اور جیسے ہی اُس نے اگلا منظر دیکھا اس کے پاؤں میں جیسے زنجیریں پڑ گئی ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی امی کے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ وہیں رک گئی۔

اس کی امی کے کمرے میں اس کی چچی مسرت اور چچا شہیر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ دونوں کیسے اس کی ماں کے کمرے کو اپنے قبضے میں لے سکتے تھے؟ یہ کمرہ تو اس کے اماں ابا کا تھا۔ ان دونوں کی زندگی کی بے شمار یادیں اس کمرے سے جڑی ہوئی تھیں، مگر آج اسی کمرے میں اس کی چچی اور چچا ایسے بیٹھے تھے جیسے ہمیشہ سے یہی ان کا حق رہا ہو۔

زہرہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

شاہد بھی اس کے پیچھے آچکا تھا۔ اس نے جب دونوں کو اس کمرے میں دیکھا تو اسے بھی تھوڑی سی حیرانی ہوئی، مگر وہ حیرانی اتنی نہیں تھی جتنی اس وقت زہرہ کے وجود پر طاری تھی۔

زہرہ نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"امی کہاں ہیں، چچا؟"

شہیر راجپوت نے بے فکری سے جواب دیا۔

"وہ تو دوسرے کمرے میں ہیں، جس کمرے میں تم سویا کرتی تھی۔ اب اس کمرے پر تو باغرا کے سردار کا ہی حق ہے۔ اسی لیے تمہاری امی نے کہا ہے کہ ہم اس کمرے میں آ کر سو جایا کریں۔ یہ کمرہ انہوں نے ہمیں دے دیا ہے۔ ویسے بھی تمہاری اماں اس اتنی بڑی حویلی میں اکیلے رہ کر کیا کریں گی؟"

چچی نے بھی زہرہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور نخوت سے بولی۔

"کم از کم یہاں آ ہی رہی تھی تو کپڑے ہی بدل لیتی، زہرہ۔ کیسی لگ رہی ہو؟ جیسے پتا نہیں کتنے دنوں سے تم نے کپڑے ہی نہیں بدلے۔ ماں باپ کے گھر بھلا ایسے آیا جاتا ہے؟"

وہ ذرا رکیں، پھر طنزیہ انداز میں بولیں۔

"اپنی نہیں تو کم از کم میکے والوں کی عزت کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔ باہر نکلو گی تو لوگ کیا کہیں گے؟ کہیں گے کہ اس کے سسرال والے اسے ٹھیک سے کپڑے بھی نہیں دیتے۔ اگر نہیں دیتے تو ہمیں بتاؤ، ہم بھجوا دیتے ہیں، لیکن باہر ہماری ناک تو مت کٹواؤ۔"

زہرہ خاموش کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

چچی کی نگاہ اب شاہد کی طرف اٹھ گئی تھی۔ اس کے لہجے اور انداز میں عجیب سا غرور تھا۔ ایسا غرور تھا کہ اب اس کے پاس وہ ساری دولت، وہ ساری جائیداد اور وہ ساری آسائشیں تھیں جو کبھی شہریار راجپوت کے پاس ہوا کرتی تھیں۔

اسے لگ رہا تھا کہ آخر کار اسے اس کا حق مل چکا ہے۔

مگر وہ یہ بھول گئی تھیں کہ کسی کا حق مار کر، کسی سے اس کی آسائشیں چھین کر اور کسی کے حصے کی خوشیاں اپنے نام کر کے آپ اپنا حق وصول نہیں کرتے۔

آپ صرف ظلم کرتے ہیں۔

اور ظلم سے حاصل کی گئی آسائشیں کبھی سکون نہیں دیتیں۔

"اور جب کسی کے گھر آتے ہیں تو سب سے پہلے سلام کرتے ہیں، زہرہ۔ تمہیں رضیہ آپا نے اتنا بھی نہیں سکھایا؟"

وہ ذرا رکیں، پھر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"خیر، تم نے تو نہیں کیا، ہم ہی تمہیں آگے بڑھ کر پیار دے دیتے ہیں۔ تم تو چھوٹی ہو، ہم تم سے تھوڑا نہ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہم بڑے ہیں نا۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھیں۔ پہلے انہوں نے شاہد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار کیا، پھر زہرہ کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

"اچھا، تم جاؤ۔ میں ملازمہ سے کہہ کر پانی اور کچھ کھانے پینے کا انتظام کرواتی ہوں۔ جا کر اپنی امی سے مل لو۔ اور ہاں، کپڑے بھی بھجواتی ہوں، بدل لینا۔ بہت بری اور نحوست سی طاری ہو رہی ہے ان کپڑوں سے۔ بدبو آ رہی ہے۔ لگتا ہے پتا نہیں کب سے تم نے کپڑے ہی نہیں بدلے۔"

اس کی بات سنتے ہی شاہد کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، زہرہ نے فوراً اس کی کلائی تھام لی۔

شاہد نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو زہرہ نے خاموشی سے سر نفی میں ہلا دیا۔

شہریار اور چچی دونوں نے یہ منظر دیکھا تھا، مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس خاموش رہے۔۔

تماشہ دیکھنے کا مزہ خاموشی میں ہی آتا ہے۔

زہرہ شاہد کو ساتھ لیے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اس وقت اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

اسے صرف اپنی ماں سے ملنا تھا۔

صرف اپنی ماں کو دیکھنا تھا۔

یہاں سے گئے اسے ابھی تین چار مہینے ہی تو ہوئے تھے، مگر ان چند مہینوں میں ہی کیا سے کیا بدل گیا تھا۔

سب کچھ بدل گیا تھا۔

کتنی بات عجیب ہے نا، وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ کتنی تیزی سے حالات اپنی کروٹ بدل لیتے ہیں۔

انسان کچھ سوچ رہا ہوتا ہے، کچھ اور خواب دیکھ رہا ہوتا ہے، اور وقت پل بھر میں اس کے سارے منصوبے، سارے خواب اور ساری امیدیں بدل کر رکھ دیتا ہے۔

وہی گھر، وہی لوگ، وہی رشتے ہوتے ہیں، مگر پھر بھی سب کچھ اجنبی سا لگنے لگتا ہے۔

اور انسان بس کھڑا سوچتا رہ جاتا ہے کہ آخر اتنی جلدی سب کچھ بدل کیسے گیا؟

"زہرہ، تم نے مجھے وہاں کچھ کہنے کیوں نہیں دیا۔ تمہارے چچا اور چچی کتنے بدزبان ہیں، انہیں ذرا سا بھی احساس نہیں کہ تمہیں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ اور تمہارے ہی گھر میں قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔"

برآمدے میں چلتے ہوئے شاہد نے اچانک زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور زہرہ کے لیے تکلیف بھی۔

زہرہ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دھیرے سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، شاہد۔ جب اتنا سب کچھ ہو سکتا ہے تو یہ بھی سہی۔ نصیب کب بدل جائے، وقت کب بدل جائے، کوئی نہیں جانتا۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، شاید ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ ہم اسے ٹال نہیں سکتے۔ لیکن جو ہے، ہم اس کے ساتھ خوش ضرور رہ سکتے ہیں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی۔

"میرے ساتھ بہت کچھ ہوا ہے، شاہد۔ آج جلال کا چہرہ دیکھ کر، اپنے چچا کا چہرہ دیکھ کر، اپنی چچی کا چہرہ دیکھ کر۔۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے سب کچھ دوبارہ دیکھ لیا ہو۔ مجھے سب یاد آ گیا ہے۔ چار مہینے پہلے ہونے والا ہر ظلم مجھے یاد آ گیا ہے۔"

اس کی آواز میں دکھ اتر آیا تھا۔ اس سے پہلے کے شاہد کچھ کہتا وہ پھر سے بولی۔

"شاہد، آپ نے بھی تو مجھ سے صرف اس لیے شادی نہیں کی تھی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس لیے آج آپ کا یہ کہنا بھی بنتا نہیں کہ آپ نے میرے ساتھ صرف محبت کی وجہ سے یہ سب کیا۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی شادی مجھ سے زبردستی کروائی تھی۔ پیسوں کی خاطر۔"

وہ شاہد کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی، مگر اس مسکراہٹ میں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"شاید میں کسی ببل میں تھی۔۔ ایک ایسے ببل میں جہاں مجھے لگتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہے، سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا پہلے
تھا۔ لیکن آج وہ ببل پھٹ گیا ہے۔ اور اب مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"آپ لوگوں نے شاید اسی وجہ سے مجھے اس گھر میں آنے نہیں دیا تھا۔ چار مہینے ہو گئے ہیں میری شادی کو، اور ان چار مہینوں میں، میں اس گھر تین چار بار آ سکی ہوں۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔

" یہاں تک کہ میرے ولیمے والے دن بھی مجھے اجازت نہیں دی گئی کہ میں اپنی ماں کے گھر آکر اُن کا حال پوچھ لوں۔ ولیمے کے بعد لڑکیاں اپنے گھر جاتی ہیں نا؟ میں نہیں جا سکی تھی۔ پچھلے مہینے آئی تھی، چند گھنٹوں کے بعد آپ مجھے واپس لے گئے تھے۔ اور آج۔۔۔ آج میں پورے ایک مہینے بعد یہاں آئی ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی، جیسے اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اور آج سب کچھ یاد آ گیا۔"

اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"میری زندگی پر کیا قیامت گزری ہے، شاہد۔۔۔ آپ اس چیز کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اور آپ مجھے یہاں کھڑے ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ میرے چچا نے ٹھیک نہیں کیا؟"

اس نے شاہد کی طرف دیکھا۔

" آپ نے بھی تو ٹھیک نہیں کیا تھا۔ آپ سب جانتے تھے پھر بھی آپ نے مجھ سے شادی کی۔"

شاہد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

زہرہ کو اپنی آواز کہیں دور کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

" آپ نے بھی تو ایک ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جو آپ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔"

"زہرہ، کیا یاد آ گیا تمہیں؟"

شاہد نے ابھی اتنا ہی پوچھا تھا کہ زہرہ نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

اس نے نظریں چرا لیں۔

"میں اُس وقت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں آپ کے سامنے ایسا ہی ظاہر کروں گی جیسے جس ببل میں میں تھی، وہ ببل ابھی تک پھٹا ہی نہیں۔ جیسے میں ابھی بھی اسی ببل میں ہوں۔ انہی خوبصورت یادوں میں، اپنے ارد گرد کے انہی خوبصورت لمحوں میں ہوں۔ جیسے میرے ساتھ کبھی کچھ برا ہوا ہی نہیں تھا۔"

اس کی آواز میں ایک عجیب سی بے بسی تھی۔

"میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتی۔ میں بس امی سے ملوں گی۔ ایک دو گھنٹے ہم یہاں بیٹھیں گے، امی سے باتیں کریں گے، اور اس کے بعد آپ مجھے واپس گھر لے جائیں گے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

"یہ حویلی میرے لیے بہت تکلیف کا باعث ہے، شاہد۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں صرف اپنی امی سے ملنے آئی تھی۔۔"

اس کی آواز اچانک بھرا گئی۔ اُس نے ساری حویلی پر نظر دوڑائی۔

"لیکن یہاں تو میری امی کے لیے ہی جگہ نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

شاہد نے اسے دیکھا تو اس کا دل جیسے دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر زہرہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے بسی

دیکھ کر اُس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

زہرہ نے روتے ہوئے بس اتنا کہا۔

"کیا کر رہی ہے زندگی میرے ساتھ؟"

"زندگی نے مجھے بچپن سے لے کر آج تک ایسے ہتھیلیوں پر اٹھا کر رکھا ہے، جیسے میں کوئی نازک سا چھالا ہوں۔ ہتھیلی کا وہ چھالا جسے ذرا سا بھی ہاتھ لگاؤ تو درد ہونے لگے۔ اور اب تو میری ساری زندگی ہی ایک ایسے چھالے کی طرح بن کر رہ گئی ہے۔۔۔ کہ جہاں بھی ہاتھ لگاؤ، وہیں سے دکھنے لگتی ہے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں تھے اور آواز میں وہ درد، جسے شاید لفظوں میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

"آپ میرے شوہر ہیں، شاہد۔ میں آپ کو چھوڑ نہیں سکتی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اور شاید یہی میری بد قسمتی ہے کہ میں آپ کو چھوڑ بھی نہیں سکتی۔"

شاہد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

زہرہ نے اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو درشتگی سے صاف کیے اور بھاری لہجے میں بولی۔

"مجھے امی سے ملنا ہے۔ آپ بھی امی سے مل لیجیے۔ پھر ہم گھر واپس چلیں گے۔"

زہرہ اپنی ماں سے ناراض تھی، لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے نا۔

ماں سے کچھ غلط فیصلے ہو بھی جائیں، اولاد کی زندگی برباد ہو بھی جائے، مگر ماں، ماں ہی رہتی ہے۔ بیٹیاں اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتیں، جیسے ایک ماں اپنے بچوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔

زہرہ نے وہاں بیٹھے ہوئے نہ تو اس گھر کے پانی کا ایک گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتارا۔ اور نہ ہی کھانے کا ایک نوالہ۔

شاہد بے بس سا وہیں بیٹھا دونوں ماں بیٹی کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی باتیں بھی کیا تھیں؟

"کیسی ہو؟"

"سسرال میں کیسا چل رہا ہے؟"

بس یہی چند عام سے سوال تھے، مگر ان کے پیچھے چھپے درد کو شاید وہ دونوں ہی سمجھ رہی تھیں۔

رضیہ بیگم جیسے مرجھا سی گئی تھیں۔ ان کی زندگی کی ساری رونق جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ شوہر کا دنیا سے چلے جانا، اکلوتی بیٹی کا ایسے گھر میں بیاہ دیا جانا جہاں سے وہ مہینوں مہینوں ان کے پاس نہیں آتی تھی، اور اوپر سے دیور اور دیورانی کا یہ رویہ۔۔

ان کے لیے سب کچھ ہی ایک عجیب سی کیفیت بن چکا تھا۔ وہ ہر چیز برداشت کر رہی تھیں۔

مگر آخر ایک ماں کتنا برداشت کرتی؟

کافی دیر تک وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہیں۔ کبھی کوئی بات ہوتی، کبھی خاموشی چھا جاتی۔ جیسے دونوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا، مگر لفظ ختم ہو گئے تھے۔ تکلیفوں کا اظہار لفظوں سے نہیں خاموشی سے کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنی تکلیفوں کا اظہار خاموشی سے کر رہی تھیں۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہو چکا تھا جب زہرہ نے اپنی ماں سے اللہ حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

وہ رضیہ بیگم کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھوڑی نہ آئی تھی۔

وہ تو صرف اپنی ماں کا حال پوچھنے آئی تھی۔

مگر جس قدر خوشی کے ساتھ وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ غم اپنے دل میں لیے وہ ایک بار پھر اس گھر سے واپس جا رہی تھی۔ دوسری بار اُتنے بھاری دل کے ساتھ وہ گھر سے گئی تھی جتنی پہلی بار گھر سے قدم نکالتے ہوئے اُسے تکلیف ہوئی تھی۔۔

اس بار بھی اس گھر سے اسے اپنی تکلیف کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ نہ سکون۔ نہ اپنائیت۔ نہ وہ گھر، جو کبھی اس کا اپنا ہوا کرتا تھا۔

وہ وہاں سے خاموشی سے چلی گئی تھی اور جاتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ اب وہ جلدی باغرا واپس نہیں آئے گی۔

یا شاید۔۔۔ وہ کبھی لوٹ کر باغرا آئے گی ہی نہیں۔

باغرا اسے محبوب تو بہت تھا، مگر وہاں موجود ہر چیز اب اس کے لیے تکلیف کا باعث بن چکی تھی۔ وہ جگہیں، وہ راستے، وہ لوگ، وہ یادیں۔۔۔ سب کچھ اسے اندر ہی اندر توڑ تا تھا۔

شاہد کے ساتھ وہ اپنے سسرال لوٹ گئی تھی۔ کبھی بھی واپس نہ آنے کے لیے۔ مگر قسمت ہمیشہ اُس کے ساتھ وہ کرتی تھی جو قسمت کو اُس کے ساتھ کرنا ہوتا تھا۔ اُس کی مرضی سے قسمت فیصلے نہیں لیا کرتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

دو بجے کے قریب عادل نڈھال سا گھر میں داخل ہوا۔ ہسپتال میں کافی وقت ضائع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی باتوں سے اُس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ اُسے ڈاکٹر پر یقین نہیں تھا۔ وہ وہاں موجود سیکیورٹی گارڈز کو بھی اپنے اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔

اسی سب میں اُسے بہت وقت لگ گیا تھا۔

جب وہ گھر میں آیا تو مہک بلکل تیار بیٹھی اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔

"اسلامُ علیکم! آ گئے آپ؟" کھڑے ہوتے ہوئے مہک نے عادل کی جانب دیکھا۔

"واسلام۔۔۔ جی اگر تیار ہیں آپ مہک تو چلیں؟" عادل کی بات سُن کر مہک نے اپنے آپ کو دیکھا۔

عادل نے بھی اُس کا سر تا پاؤں کا جائزہ لیا۔ وہ تیار کھڑی تھی۔ وہ اُسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ عادل کو لگا تھا وہ اُس کی سبز آنکھوں میں ڈوب جائے گا۔

وہ اُسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ سارے دن کی تھکان ایک نظر میں اُتر گئی تھی۔

"جی چلیئے محترمہ۔۔۔" مہک کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے اُس نے اپنی باہوں کو اُس کے لیے کھولا تھا۔ مہک مسکراتے ہوئے اُس کے پاس سے گزری تھی۔

"عادل آپ گاڑی میں انتظار کریں میں امی کو بتا دوں۔۔" عادل نے سر تسلیمِ خم کر دیا تھا۔ وہ خوش ہوئی تھی۔

عادل باہر کی جانب بڑھ گیا اور مہک کیچن کی جانب چلی گئی۔

کچھ ہی لمحے گزرے تھے جب عادل کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر مہک آکر بیٹھ چکی تھی۔

"ڈاکٹر کو سب بتانا کہ کیا کیا مسائل ہیں اوکے۔۔۔" گاڑی کو اسٹارٹ کرتے ہوئے عادل نے مہک سے کہا۔ مہک نے اُس کی بات سُنی تو سر کو ہلاتے ہوئے سیٹ بیلٹ پہننے لگی۔

اُن سب کی زندگیاں جس روش پر بہہ رہی تھیں سب نے اُسی ڈگر پر زندگی کی ڈور کو جانے دیا۔

مارچ کے آخر میں نگینہ کی شادی تھی، اور پھر وہ شادی بھی ہو گئی۔ باقی دن بھی اسی طرح گزرتے رہے۔

وقت چلتا رہا، دن

مہینوں میں بدلتے رہے اور زہرہ خاموشی سے اپنی زندگی کو آگے بڑھاتی رہی۔ باقی سب کی زندگی بھی ایک معمول کے مطابق گزرتی رہی۔

زہرہ کا اور شاہد کا رشتہ بہت خوبصورت تھا۔ دونوں کے درمیان محبت نہیں تھی۔ یاں یوں کہا جائے زہرہ کو شاہد سے محبت ہو نہیں پا رہی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے احساس تھا، ایک دوسرے کا خیال تھا۔

محبت کا نام نہیں تھا۔ شاہد کو محبت تھی مگر وہ اظہار کرنا چھوڑ چکا تھا۔

اور اصل محبت تو یہی ہے کہ محرم بنا جتائے آپ کا خیال رکھے۔

لیکن اس کی ساس اور اس کے سسرال والے جیسے اس کی زندگی کو ہر ممکن طریقے سے مشکل بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

وہ صرف صبر اور شکر کر رہی تھی۔ زہرہ پھر بھی خاموش تھی۔

کیونکہ اس کے پاس نہ تو میکے والے تھے، نہ ہی سسرال والے۔

اس کے پاس صرف ایک شخص تھا اور وہ تھا اس کا شوہر۔

شاہد۔

اور شاید اس کے پاس کچھ اور بھی تھا، مگر وہ نہیں جانتی تھی۔

وہ بس خاموشی سے چلتی رہی۔۔

جس روش پر زندگی بہہ رہی تھی، اس نے بھی اسے اسی روش پر بہنے دیا۔

پھر ستمبر کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ زہرہ بہت خوش تھی۔

اپنے بیٹے کو پہلی بار دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی خوشی تھی جسے شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر پھر بھی۔۔ دل کے کسی ایک کونے میں ایک ہلکی سی کسک ضرور اٹھی تھی۔

کچھ خواہشیں جب ٹوٹ جاتی ہیں نا، تو ان کا درد خوشیوں کے درمیان بھی محسوس ہوتا رہتا ہے۔

جب آنکھوں میں خوابوں اور خواہشوں کے آنسو جمع ہو جائیں، تو مسکراتے ہوئے بھی دل بہت تکلیف میں ہوتا ہے۔

زہرہ کو بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

مگر اپنے بیٹے کو دیکھ کر اس نے بہت سے غم اپنے اندر ہی اندر پی لیے تھے۔

وہ اسے دیکھتی اور خود کو سمجھاتی کہ یہی تو اس کی خوشی ہے۔

اور اگر شاہد اس سے محبت کرتا تھا، تو زہرہ کے لیے شاید یہی سب کچھ تھا۔ لیکن اُس نے خود کے لیے یہ تو کبھی چاہا ہی نہیں تھا۔

زندگی چلتی جا رہی تھی، زندگی بھلا کہاں کسی کے لیے رُکا کرتی ہے۔ زہرہ کو بھی اب عادت ہو چکی تھی، چھوٹے موٹے کام وہ خود ہی کر لیا کرتی تھی۔ کیونکہ بچپن سے لے کر شادی تک اس نے اپنے گھر میں کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ شادی کے بعد ہی اس نے گھر سنبھالنا اور زندگی کے یہ سب کام سیکھے تھے۔

شاہد نے بھی اس کی بہت مدد کی تھی، اس کے لیے آسانیاں پیدا کی تھیں۔

تکلیف تو اسے اب بھی ہوتی تھی، مگر وہ اپنی زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں سے نہیں مل سکتی تھی، باغرا نہیں جا سکتی تھی۔ اپنے ہی گھر، اپنی ہی ماں سے دور۔ کیسا دکھ تھا۔

پھر جب اس کا بیٹا شہزاد اس دنیا میں آیا تو جیسے اس کی زندگی میں کچھ رنگ واپس آ گئے۔ وہ سارا دن اسی کی پرورش میں لگی رہتی، اسی کا خیال کرتی، اسی کے ساتھ وقت گزارتی۔ اب اس کے لیے شاہد اور اس کا بچہ ہی اس کی پوری کائنات تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باقی تمام دکھوں کو بھی انہی کے درمیان بھلا دیتی تھی۔

نجمہ اسے باتیں سناتی، کبھی کسی بات پر طعنہ دیتی، مگر زہرہ زیادہ تر خاموش رہ کر در گزر کر جاتی۔

ماؤں کو اپنے ان بیٹوں کی شادی نہیں کرنی چاہیے اکلوتے ہوں۔ جو ان کے لیے صرف بیٹے نہیں بلکہ لاڈلے ہوں، کیونکہ پھر وہ اپنے بیٹے کے ہمسفر کو کبھی دل سے قبول نہیں کر پاتیں۔ انہیں اپنا بیٹا تو ہر حال میں نظر آتا ہے، مگر اس کے ساتھ کھڑی عورت ایک انسان کی حیثیت سے دکھائی ہی نہیں دیتی۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتیں کہ ان کے بیٹے کی زندگی میں ایک اور عورت بھی اتنی ہی اہم ہو سکتی ہے۔

اور خاص طور پر ایسی ماؤں کو اپنے بیٹوں کی شادی نہیں کرنی چاہیے جو انہیں اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ کیونکہ پھر وہ اپنے بیٹے کی خوشی سے زیادہ اپنی خواہش کو اہمیت دیتی ہیں، اور انجانے میں دو لوگوں کی زندگیوں کو جہنم بنا دیتی ہیں۔

وہیں دوسری طرف عادل اور مہک کو اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت پیاری سی بیٹی سے نوازا تھا۔ خوبصورت سبز آنکھوں والی، پیارے پیارے نقوش والی ایک ننھی سی جان۔ وہ بالکل کمال جیسی لگتی تھی، بس اس کی آنکھیں سبز تھیں بالکل اپنی ماں جیسی، باقی نقوش میں وہ کمال کی ہی جھلک لیے ہوئے تھی۔

ویسے بھی چھوٹے بچوں کے چہروں پر ایک عجیب سی معصومیت ہوتی ہے، ایسی معصومیت جسے دیکھ کر انسان اپنی تمام پریشانیاں کچھ دیر کے لیے بھول جاتا ہے۔

اس سب عرصے میں راجپوتوں نے کمال کو بہت سے ہسپتالوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر اُس کا نام اور پہچان بدلنے کی وجہ سے وہ اُسے ڈھونڈ نہیں سکے۔

سب کے لیے زندگی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی، لیکن کمال۔۔۔ وہ ابھی تک وہیں تھا، اسی ہاسپٹل میں۔ پہلے سے کافی بہتر ہو چکا تھا، اس کی حالت میں بہتری آ رہی تھی، مگر زندگی سے جیسے وہ روٹھ سا گیا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ زندگی کو دوبارہ اپنانے کی کوشش کی تھی، خود کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ شاید اب اسے آگے بڑھنا چاہیے، مگر وہ ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ جتنا وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی اندر سے بکھر جاتا۔

وہ بہت تکلیف سے گزر رہا تھا، ایسی تکلیف جسے وہ کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور شاید اسی تکلیف نے اس کے

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چھین لی تھی۔ وہ کچھ سوچنے سے قاصر تھا، کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس ایک ہی جگہ رُکا ہوا تھا۔

زمل کے ہونے کے بعد عادل نے کمال کو گھر میں ہی شفٹ کر دیا گیا تھا۔ شاید اپنوں میں رہ کر اُسے کچھ ذہنی سکون ہو اور حالت بہتر ہو۔

اور ایسا کرنے سے حالات کافی بہتر ہوئے تھے۔ عادل نے نرسز بھی گھر میں اُس کے لیے رکھوائی تھیں۔

کمال کا ذہن زمل کی وجہ سے کافی فریش رہنے لگا تھا۔ اُسے زمل بہت پیاری لگتی تھی۔

کمال اپنے کمرے میں ہی تھا۔ ایک دن جب نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے مہک اور عادل کے کمرے میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ شاید وہ کچھ دیر زمل کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اسے پیار کرنا چاہتا تھا، اس ننھی سی جان کو اپنے قریب محسوس کرنا چاہتا تھا۔

اس کی حالت ابھی بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ خود چل کر کہیں جا سکتا۔ نرس اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر آہستہ آہستہ کمرے کی طرف لے کر جا رہی تھی۔ کمال خاموشی سے وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ابھی وہ برآمدے تک ہی پہنچا تھا، جب اچانک اندر سے آتی ہوئی مہک کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

کمال چونک کر وہیں رک گیا۔

اس نے فوراً نرس کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اسے وہیل چیئر وہیں روک دینے کو کہا۔

نرس بھی خاموشی سے وہیں رک گئی۔

کمال نے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ بس وہیں بیٹھا، خاموشی سے اندر سے آتی ہوئی مہک اور عادل کی آواز سنتا رہا۔

اور پھر جو الفاظ اس کے کانوں میں پڑے، انہوں نے جیسے اس کے ذہن کو شل کر دیا۔

اس کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے تھے۔

وہ کچھ لمحوں تک بالکل ساکت بیٹھا رہا، جیسے سنی ہوئی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ شاید اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے، وہ حقیقت تھی۔

کتنے راز ہوتے ہیں جو لوگ اپنے سینوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ مگر جب اپنے ہی اپنوں سے راز چھپانے لگیں، تو پھر انسان زندگی میں دوسروں پر بھروسہ کیسے کرے؟

کمال کے لیے شاید یہ صرف ایک راز نہیں تھا۔ یہ اس کے اپنے لوگوں پر کیے گئے یقین کا امتحان تھا۔

کمال نے مہک کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

اور جب ساری حقیقت اس کے سامنے آ چکی تھی تو جیسے اس کے اندر کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ دکھ، افسوس، رنج، ملال۔۔۔ کیا کچھ نہیں تھا اس کے اندر؟ ایک ایسی؟ ایک ایسی تکلیف تھی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ جس حقیقت کے ساتھ وہ اتنے عرصے سے جیتا آ رہا تھا، آج اچانک وہی حقیقت جھوٹ بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

**(جاری ہے۔)**